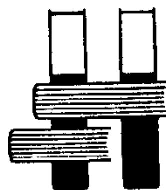
انسانی تہذیب کا ارتقاء

ول ڈیورانٹ

اِنسانی تہذیب کا ارتقاء

مصنف : ول ڈیورانٹ

مترجمہ : تنویر جہاں



فِکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور

نام کتاب ☜ انسانی تہذیب کا ارتقاء

مصنف ☜ ول ڈیورانٹ

ترجمہ ☜ تنویر جہاں

پبلشرز ☜ فکشن ہاؤس

18-مزنگ روڈ' لاہور

فون:7249218-7237430

اہتمام ☜ ظہور احمد خاں

پرنٹرز ☜ آفتاب عالم پریس لاہور

سرورق ☜ عباس

اشاعت اول ☜ 1993ء

اشاعت دوم ☜ 1999ء

اشاعت سوم ☜ 2004ء

قیمت ☜ -/140 روپے

فہرست

پیش لفظ

تہذیب وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافتی تخلیق کو فروغ دیتی ہے۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور فکر و احساس کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، علم و ادب، حکمت و فلسفہ، عقائد و افسوں، فنونِ لطیفہ، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔

بعض عوامل تہذیب کو متعین کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلا عامل ارضیاتی حالات ہیں۔ دوسرے نمبر پر جغرافیائی حالات ہیں جو تہذیب کی ترقی میں ممد و معاون بھی ہو سکتے ہیں اور باعثِ رکاوٹ بھی۔ معاشی حالات زیادہ اہم ہیں کیونکہ اگر انسان اپنے وجود کی بقاء کے لیے جانوروں کا پیچھا کرنے پر ہی انحصار کرتا تو بربریت سے تہذیب تک کا سفر کبھی بھی طے نہیں کر سکتا تھا۔

تہذیب کے لیے کوئی نسلی شرائط نہیں۔ یہ کسی بھی براعظم، رنگ اور نسل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کوئی بڑی نسل تہذیب کو پیدا نہیں کرتی بلکہ یہ بڑی تہذیب ہی ہے جو قوموں کی تخلیق کرتی ہے۔ تہذیب صرف اس اعتبار سے نسل سے تعلق رکھتی ہے کہ مختلف نسلوں کی باہم شادیاں بتدریج نسبتاً متجانس قوم میں رچ بس جاتی ہیں اور ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ تہذیب کوئی خلقی شے نہیں نا ہی یہ لازوال ہے۔ تہذیبیں بنتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ دنیا کی ہر پرانی اور نئی تہذیب کی تشکیل مندرجہ ذیل عناصر ترکیبی سے

ہوئی ہے ؛

جغرافیائی حالات

معاشی عوامل ۔ سیاسی تنظیم ، اخلاقی روایات اور علم و فن کی جستجو انہی عوامل کا عمیق مشاہدہ اس ترجمے کا مقصد ہے ۔ زیرِ نظر کتاب ول ڈیورانٹ کے شہرۂ آفاق کتابی سلسلے " انسانی تہذیب کا ارتقاء " کی جلد اوّل کا پہلا حصہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی جامع ہے اور اس خواہش کے تحت ترجمہ کیا گیا ہے کہ قارئین کو مبادیاتِ تہذیب پر آسان اور قابلِ فہم مواد مہیا کیا جا سکے ۔

اگرچہ مشرقی تہذیبوں سے متعلق مغربی زبانوں میں بے شمار کتابیں ملتی ہیں لیکن اُردو زبان کا خزانہ ان بیش قیمت نوادرات سے ہنوز خالی ہے ۔ نتیجتاً ہم اپنے آباؤ اجداد کے تخلیقی اور تعمیری کارناموں سے پوری طرح واقف نہیں ۔ مترجمہ نے " داستانِ تہذیب " سے چند منتخب تہذیبوں کے حوالے سے ترجمہ کرنا شروع کیا ہے تاکہ عدم واقفیت کا تدارک کیا جا سکے ——— منتخب تہذیبیں وہ جن کا براہِ راست یا بالواسطہ ہماری تہذیب سے گہرا ربط ہے ۔

تنویر جہاں

پہلا باب

تہذیب کے تقاضے

تہذیب وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافتی تخلیق کو فروغ دیتی ہے۔ چار عناصر مل کر تہذیب کو متشکل کرتے ہیں۔ معاشی بہم رسانی، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علم وفن کی جستجو، تہذیب ابتری اور بدنظمی کے خاتمے سے شروع ہوتی ہے کیونکہ جب خوف پر قابو پالیا جاتا ہے تو تجسس اور تعمیری اُپچ آزاد ہو جاتے ہیں اور انسان قدرتی طور پر زندگی کی تفہیم و تزئین کی طرف بڑھتا ہے۔

بعض عوامل تہذیب کو متعین کرتے ہیں۔ وہ یا تو اس کے لئے باعثِ تقویت ہوتے ہیں یا اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان میں سے پہلا عامل ارضیاتی حالات ہیں۔ تہذیب برفانی ادوار کا درمیانی وقفہ ہے۔ کسی بھی وقت یخ بستگی کی یہ لہر دوبارہ کھڑی ہو کر انسانی کارناموں کو برف سے ڈھانپ کر زندگی کو زمین کے کسی چھوٹے سے ٹکڑے تک محدود کر سکتی ہے یا زلزلے کا دیوتا بے نیازی سے اپنے شانے ہلا کر ہمیں ہمیشہ کے لئے تباہ کر سکتا ہے۔

دوسرا عامل جغرافیائی حالات ہیں۔ خطوطِ سرطان وجدی کی گرمی اور اس علاقے میں پائی جانے والی اَن گنت طفیلی مخلوق تہذیب کی دشمن ہے۔ کاہلی، بیماری، قبل از وقت بلوغت اور موت زندگی کے ان لوازمات سے، جو تہذیب کی

تشکیل کرتے ہیں، توانائیاں چھین کر انہیں بھوک اور تولید میں ضم کر دیتی ہیں فنون اور ذہن کے کرنے کو کچھ باقی نہیں رہتا۔ بارش لازمی ہے کیونکہ پانی زندگی کا ذریعہ ہے اور سورج کی روشنی سے زیادہ اہم ہے۔ عناصر کی ناقابلِ فہم لہر نینوا اور بابل جیسے علاقوں کی توڑ پھوڑ کر سکتی ہے۔ جہاں کبھی بادشاہت اور صنعت ہوتی تھی، یا برطانیہ اور بگمل ساؤنڈ جیسے شہروں کی طاقت اور دولت بڑھانے میں مدد کر سکتی ہے۔ جو نقل و حمل اور خبر رسانی کی مین لائن سے دور رہے ہوں۔ اگر زمین فصلوں اور معدنیات کے لئے زرخیز ہے۔ اگر دریا تبادلے کے آسان ذرائع مہیا کرتے ہیں اور اگر ساحل سمندر تجارتی جہازوں کے لئے قدرتی بندرگاہیں موجود ہیں۔ اگر کوئی قوم عالمی تجارت کی شاہراہ پر واقع ہے مثلاً ایتھنز، کارتھیج، فلورنس یا وینس تو جغرافیائی حالات تہذیب کی ترقی میں مدد کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کی تخلیق نہیں کر سکتے۔

معاشی حالات زیادہ اہم ہیں۔ کوئی قوم امریکی انڈینز کی طرح باقاعدہ ادارے ایک عالمی ضابطۂ اخلاق اور فنون کی معمولی قسموں کی حامل ہوتے ہوئے بھی اگر شکار کے مرحلے تک محدود رہے اور اپنے وجود کی بقاء کے لئے جانوروں کا پیچھا کرنے پر انحصار کرے تو یہ بربریت سے تہذیب تک کا سفر طے نہیں کر سکے گی۔ ایک عربی بدو جیسا خانہ بدوش بہت زیادہ ذہین اور طاقتور ہو سکتا ہے۔ وہ کردار کی اعلیٰ خوبیوں جرأت، فیاضی اور نیکی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ لیکن کلچر کی لازمی شرط، غذا کی مسلسل فراہمی کے بغیر اس کی ذہانت شکار کے خطرات اور تجارت کی چالاکیوں میں ضائع ہو جائے گی اور تمدن کی تزئین و زیبائش، تہذیب و تسلیمات اور فنون و آسائش کے لئے کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ کلچر کی پہلی شکل زراعت ہے۔ اس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب انسان زمین کاشت کرنے کے لئے ایک جگہ ٹھہر جاتا ہے اور غیر یقینی مستقبل کے لئے اشیاء بچا کر رکھ لیتا ہے۔ تحفظ کے

اس چھوٹے سے دائرے میں پانی اور غذا کی معقول فراہمی کے سبب وہ اپنے جھونپڑے، معبد، اسکول بناتا، پیداواری آلات ایجاد کرتا اور کتے، گدھے، سور اور آخر میں اپنے آپ کو سدھاتا ہے۔ وہ نظم و ضبط اور باقاعدگی سے کام کرنا سیکھتا ہے۔ زیادہ طویل عرصے تک زندہ رہتا اور اچھی نسل کے ذہنی اور اخلاقی ورثے کو پہلے سے زیادہ بھرپور انداز میں اگلی نسل تک منتقل کرتا ہے۔

کلچر زراعت کا تقاضا کرتا ہے جبکہ تہذیب شہر کا۔ ایک پہلو سے تہذیب شائستگی کا لباس ہے اور شائستگی وہ نفاست ہے جو شہر میں بسنے والوں نے صرف شہر ہی میں ممکن سمجھی۔ کیونکہ دولت اور ذہانت جو دیہی علاقوں میں پیدا ہوتی ہے شہر میں جمع ہو جاتی ہیں۔ شہروں میں ایجادات اور صنعت سہولیات تعیشات اور فراغت کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ شہروں میں تاجر ملتے اور اشیاء اور خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ تجارت کے ان مقامات پر ذہن ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ ذہانت تیز ہوتی ہے اور تخلیق قوت میں ڈھل جاتی ہے۔ شہروں میں کچھ لوگ مادی کاروبار سے علیحدہ ہو کر سائنس، فلسفہ، ادب اور آرٹ تخلیق کرتے ہیں۔ تہذیب کسانوں کے جھونپڑوں سے شروع ہوتی ہے لیکن اس کی افزائش شہروں میں ہوتی ہے۔

تہذیب کے لئے کوئی نسلی شرائط نہیں۔ یہ کسی بھی براعظم اور کسی بھی رنگ و نسل، بیکن یا دہلی، میمفس یا بابل، روینا یا لندن، پیرو یا یوکاتان میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کوئی بڑی نسل تہذیب کو پیدا نہیں کرتی بلکہ یہ بڑی تہذیب ہی ہے جو قوموں کو پیدا کرتی ہے۔ جغرافیائی اور معاشی حالات کلچر کو بیدار کرتے ہیں اور کلچر ایک نمونہ (TYPE) تخلیق کرتا ہے۔ انگریزوں نے انگریزی تہذیب کو تخلیق نہیں کیا بلکہ اس (تہذیب) نے ان کو تخلیق کیا ہے۔ اگر وہ اسے اپنے ساتھ

ساتھ لئے پھرتا ہے اور مخصوص لباس پہن کر کھانا کھاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس وقت نئی تہذیب تخلیق کر رہا ہے بلکہ وہ اپنی روح پر اس تہذیب کی حکمرانی تسلیم کرتا ہے۔ ایسے ہی مادی حالات کسی اور نسل کے پاس ہوں تو وہ ایسے ہی نتائج پیدا کرے گی۔ جاپان بیسویں صدی میں انگلستان کی انیسویں صدی کی تاریخ نئے سرے سے پیدا کر رہا ہے۔ تہذیب صرف اس اعتبار سے نسل سے تعلق رکھتی ہے کہ مختلف نسلوں کی شست رد یا باہمی شادیاں اس کی پیش رو ہوتی ہیں اور وہ بتدریج نسبتاً متجانس (Homogeneous) قوم میں رچ بس جاتی ہیں۔

جسمانی یا حیاتیاتی حالات تہذیب کی فقط پیشگی ضروریات ہیں وہ اسے متشکل نہیں کرتیں۔ بعض باریک نفسیاتی عوامل اپنا کام دکھاتے ہیں۔ سیاسی نظم وضبط ہونی چاہیئے خواہ یہ ابتری کے قریب ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ نشاۃ ثانیہ کے وقت فلورنس یا روم میں تھی۔ انسانوں کو یہ احساس ہو کہ ہر قدم پر انہیں موت اور ٹیکسوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ذہنی تبادلے کے لئے کچھ نہ کچھ زبان کی وحدت کا ہونا ضروری ہے۔ خاندان، چرچ یا اسکول کے ذریعے ایک متحد کرنے والا ضابطۂ اخلاق ہونا چاہیئے، زندگی کے کھیل میں کچھ ایسے قوانین ہونے چاہئیں جن کو وہ بھی تسلیم کریں جو ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ قوانین طرزِ عمل کو ایک ترتیب، ضابطہ، سمت اور تحرک دیں۔ بنیادی تیقن میں بھی عقیدے کی مافوق الفطرتی یا خیالی وحدت ہونی چاہیئے جو اخلاقیات کو اعداد وشمار سے پرجوش محبت تک لے جاتی ہے اور ہماری فانی زندگی کو شرافت اور معنویت دیتی ہے۔ آخری بات یہ کہ تعلیم کوئی نہ کوئی تکنیک، خواہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو، ہونی چاہیئے تاکہ کلچر کی ترسیل ہو سکے۔ نقل، تعلیم، ماں باپ، استاد یا پادری، قبیلے کی روایات اور وراثت، زبان اور علم، اخلاق اور عادات ان تمام ذرائع کے لئے اس کی ٹیکنالوجی اور فنون نئی نسل کے حوالے کرنے چاہئیں،

کیونکہ یہی وہ ہتھیار ہیں جن کے ذریعے وہ جانور سے انسان بنتے ہیں۔

ان حالات کے غائب ہو جانے سے، بعض اوقات ان میں سے کسی ایک کے غائب ہونے سے تہذیب تباہ ہو سکتی ہے۔ ایک ارضیاتی طغیانِ عظیم یا مکمل موسمی تبدیلی، ایک بے قابو وبا جس نے روم میں انتونینز کے دورِ حکومت میں آدھی آبادی کا صفایا کر دیا تھا یا کالی موت (Black Death) جس نے جاگیردارانہ عہد کو ختم کرنے میں مدد دی۔ جاگیر کا خاتمہ یا شہر کے ہاتھوں دیہات کا استحصال سے زراعت کی تباہی غیر ملکی خوراک کی رسد پر خوفناک انحصار کا نتیجہ بنی۔ قدرتی ذرائع، ایندھن یا خام مال کی ناکامی، تجارت کے راستوں میں تبدیلی نے ایک قوم کو عالمی تجارت کی مین لائن سے الگ کر دیا۔ شہری زندگی کی پریشانیوں اور رابطوں کی وجہ سے ذہنی یا اخلاقی انحطاط، سماجی نظم وضبط کے روایتی ذرائع کا ٹوٹنا اور اسے تبدیل کرنے کی نا اہلیت، ایک منتشر جنسیاتی زندگی، ابیقوریت، قنوطیت یا متوکل فلسفوں سے نسل کا کمزور پڑنا۔ قابل لوگوں کا بنجر پن اور ان خاندانوں کا نسبتاً چھوٹا پن جو ایک نسل کی ثقافتی وراثت کو مکمل طور پر اگلی نسل کے حوالے کر سکتے ہیں۔ دولت کا مرضیاتی ارتکاز جو طبقاتی لڑائیوں کا سبب بنتا ہے، انتشار انگیز انقلابات اور مالی دیوالیہ پن ــــــ یہ باتیں ایسی ہیں جن سے تہذیبیں مر سکتی ہیں۔ تہذیب کوئی خلقی شے نہیں اور نہ ہی یہ لازوال ہے، ہر نسل کو اسے نئے سرے سے حاصل کرنا چاہیئے۔ اس کی مالیت یا ترسیل میں کوئی کمی و قبیح مداخلت اسے ختم کر سکتی ہے۔ انسان جانور سے صرف تعلیم کے اعتبار سے مختلف ہے، جس کی تعریف تہذیب کی ترسیل کی تکنیک سے کی جا سکتی ہے۔

تہذیبیں نسلی روح کی سیڑھیاں ہوتی ہیں جس طرح خاندانی افزائش اور پھر تحریر نسلوں کو آپس میں مربوط کرتی ہیں، مرتے ہوئے لوگوں کی روایات کو

نوجوانوں کے حوالے کرتی ہیں۔ اسی طرح طباعت، تجارت اور خبر رسانی کے ہزاروں طریقے تہذیبوں کو ماضی اور مستقبل کی تہذیبوں کے لئے جو کچھ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اُسے محفوظ رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ مرنے سے پہلے اپنی تہذیبی وراثت کو اپنے بچوں کے سپرد کر دیں۔

دوسرا باب

تہذیب کے معاشی عوامل

ایک اہم اعتبار سے "وحشی" بھی مہذب ہے کیونکہ وہ نہایت احتیاط سے اپنے بچوں کو قبیلے کی وراثت اور وہ تمام معاشی، سیاسی، ذہنی اور اخلاقی عادات و دستور منتقل کرتا ہے جنہیں اس نے زمین پر زندہ رہنے کے دوران تخلیق کیا اور ترقی دی۔ یہاں سائنسی طریقہ کار سے سوچنا ناممکن ہے کیونکہ دوسرے انسانوں کو "وحشی" یا غیر مہذب کہہ کر ہم کوئی معروضی حقیقت بیان نہیں کر رہے بلکہ اپنے لئے شدید محبت اور دوسروں کے طریقِ زندگی سے شرم کا اظہار کر رہے ہیں بے شک ہم ان سادہ لوگوں کے متعلق غلط اندازے لگاتے ہیں جنہوں نے ہمیں مہمان نوازی اور اخلاق میں بہت کچھ سکھایا ہے۔ اگر ہم تہذیب کی بنیادوں اور اجزائے ترکیبی کی فہرست مرتب کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ برہنہ قوموں (Naked nation) نے یہ تمام لوازمات حاصل کر لئے تھے اور ہمارے لئے تزئین و زیبائش اور تحریر کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ غالباً وہ بھی کبھی مہذب تھیں اور زیبائش و تحریر کو

---

[1] اس کتاب میں لفظ "تہذیب" سے مراد سماجی تنظیم، اخلاقی نظام اور ثقافتی سرگرمی ہے۔ کلچر سے مراد عادات و اطوار فنون یا لوگوں کے اداروں، دستور اور فنون کا مجموعہ ہے۔ موخرالذکر اعتبار سے لفظ کلچر، غیر متمدن اور قبل از تاریخ معاشروں کے حوالے سے استعمال ہوگا۔

تکلیف دہ شے سمجھ کر اس سے باز رہتی تھیں۔ ہمیں اپنے ہم عصر آباؤ اجداد کے لئے "وحشی" اور "غیر مہذب" جیسی اصطلاحات کا استعمال کم کرنا چاہیئے۔ ہمیں اُن قبیلوں کو جو غیر پیداواری دنوں کے لئے کچھ بچا کر نہیں رکھتے اور تحریر کا استعمال نہیں کرتے غیر متمدن کہنا چاہیئے اور موازنے کے طور پر انہیں متمدن کہنا چاہیئے جو پڑھے لکھے ہوں۔

۱ شکار سے کاشت تک

ایک دن میں تین دفعہ کھانا ایک انتہائی ترقی یافتہ دستور ہے۔ وحشی لوگ یا تو بہت زیادہ کھاتے ہیں یا فاقہ کرتے ہیں۔ امریکی انڈینز میں بعض جنگلی قبائل اگلے دن کے لئے خوراک محفوظ رکھنا نامناسب سمجھتے ہیں۔ آسٹریلیا کے مقامی باشندے ایسی محنت نہیں کر سکتے جس کا فوری اجر نہ ملے۔ ہر ہاٹنٹاٹ (Hottentot) فارغ البال ہے جبکہ افریقہ کے جنگلی "یا تو ضیافت اُڑاتے ہیں یا قحط کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کوتاہ اندیشی میں دیگر "غیر متمدن" عادات کی طرح ایک گونگی عقل بھی شامل ہے۔ جس لمحے انسان کل کے متعلق سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ خوشیوں کے باغ سے نکل کر اندیشوں کی وادی میں داخل ہو جاتا ہے۔ غم اُس کی ذات میں مسکن بنا لیتے ہیں، لالچ بڑھ جاتا ہے، ملکیت شروع ہو جاتی ہے اور بے فکرے انسان کی حقیقی خوشی غائب ہو جاتی ہے۔ آج کل امریکی نگیرو اس تغیر سے گزر رہا ہے۔ پیری نے اپنے ایک اسکیمو گائیڈ سے پوچھا "کس کے متعلق سوچ رہے ہو؟" اُس نے جواب دیا۔ "مجھے سوچنا نہیں پڑتا۔ میرے پاس بہت سا گوشت ہے۔" اس وقت تک نہ سوچو جب تک سوچنا نہ پڑے۔ یہی عقل کا حاصل ہے۔

تاہم اس لاپرواہی میں بھی مشکلات ہیں اور جو عضویہ اس پر قابو پا لیتے

ہیں وہ جہدِ بقا میں واضح فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ کتا جس نے ہڈی زمین میں دبا دی، گلہریاں جو بعد کی خوراک کے لئے جوز (Nuts) اکٹھے کرتی ہیں شہد کی مکھیاں جو شہد سے چھتہ بھر دیتی ہیں اور چیونٹیاں جو مشکل دنوں کے لئے خوراک کا ذخیرہ کر لیتی ہیں۔ در حقیقت تہذیب کے پہلے خالق ہیں۔ ایسی مخلوق نے ہمارے قدیم آباؤ اجداد کو آج کے زائد مال میں سے کل کے لئے بچا کر رکھنے کا فن سکھایا۔ گرمیوں کی بہتات سے سردیوں کے لئے کچھ بچا رکھنا۔

ہمارے ان آباؤ اجداد نے کس مہارت سے سمندر اور زمین سے کھود کھود کر خوراک نکالی جس پر ان کے سادہ معاشرے کی بنیاد تھی۔ انہوں نے خالی ہاتھوں سے زمین سے قابلِ خورد اشیاء نکالیں۔ انہوں نے جانوروں کے پنجے اور دانت استعمال کئے اور ہاتھی دانت، ہڈیوں اور پتھروں سے اوزار بنائے۔ مچھلیوں اور دوسرے شکار کے لئے ریشے کے جال بُنے۔ غرضیکہ اَن گنت ترکیبیں اختراع کیں۔ پولی نیشیوں کے پاس ہزاروں گز لمبے جال تھے جن کو سینکڑوں انسان مل کر استعمال کرتے تھے۔ ان طریقوں سے سیاسی تنظیم کے ساتھ ساتھ معاشی حصول بڑھتا گیا اور خوراک کی متحدہ تلاش کے سبب ریاست وجود میں آئی۔ تنگو مچھیرے اپنے سر پر سیل مچھلی کی طرح کی ٹوپی پہنتے۔ اپنے آپ کو پہاڑیوں کے پیچھے چھپا لیتے اور سیل کی طرح آواز نکالتے، مچھلیاں اُن کی طرف آنے لگتیں تو وہ ان میں نیزہ گھونپ دیتے۔ بہت سے قبیلے مچھلیوں میں بے ہوش کر دینے والی دوائیں ڈال دیتے تاکہ آسانی سے مچھلیاں پکڑی جا سکیں۔ مثلاً تاہیتی پانی میں بوٹیوں کے جو زیا بورا کے پودے سے بنا ہوا بے ہوش کرنے والا آمیزہ ڈالتے تھے۔ مچھلیاں اسے پی کر بڑے مزے سے تیرتی ہوئی سطح پر آ جاتی تھیں اور مچھیرے انہیں پکڑ لیتے تھے آسٹریلیا کے مقامی باشندے تہہ آب تیرتے ہوئے نیچے سے بطخوں کی ٹانگیں

پکڑ لیتے تھے اور جب تک وہ خاموش نہ ہو جاتیں انہیں پکڑے رکھتے تھے۔ تمام سخت ریشے کے ساتھ گری پرو کر اُسے زمین میں آدھا گاڑ دیتے۔ یہ پرندے گری کھاتے اور تمام پرندے کھاتے۔

ہم میں سے اکثر کے لئے شکار ایک کھیل ہے جو قدیم دنوں کی یاد تازہ کرتا ہے جب یہ شکاری اور شکار دونوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا کیونکہ شکار صرف خوراک کی تلاش ہی نہیں بلکہ سلامتی اور غلبے کی جنگ تھی۔ ایک ایسی جنگ جس کے سامنے تاریخ کی لکھی ہوئی جنگیں محض شور شرابا ہیں۔ جنگل میں انسان آج بھی زندگی کی جنگ لڑتا ہے اگرچہ جنگل میں جانور خوراک سے بہت زیادہ مایوس ہو کر یا شکاری سے جھلک کر ہی انسان پر حملہ کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ سب کے لیئے کھانا نہیں ہوتا اور بعض اوقات صرف جنگجوؤں کو ہی کھانے کی اجازت ملتی ہے۔ ہم اپنے عجائب گھروں میں ان لوگوں کی جنگ کی یادگاریں چھریاں، بھالے، تیرے، تیر، کمندیں، جال، بوم رینگ اور گلے کی پٹیاں دیکھتے ہیں۔ جن کے ساتھ قدیم انسان نے زمین پر قبضہ جمایا اور بجز انسان آئندہ کی تاخلف نسلوں کو جانوروں سے تحفظ سکھایا۔ حتیٰ کہ آج بھی ان تمام خوفناک جنگوں کے بعد کتنی نسلیں زمین پر زندہ ہیں۔ بعض اوقات جنگل میں گھومتے ہوئے انسان وہاں بولی جاتے والی زبانوں کی رنگا رنگی سے حیران رہ جاتا ہے۔ کیڑے مکوڑوں رینگنے والے جانوروں اور گوشت کھانے والے جانوروں اور پرندوں کو دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ ایسے احساس ہوتا ہے کہ انسان اس ہنگامہ پرور منظر میں بے جا مداخلت کرتا ہے اور وہ کائناتی دہشت اور تاختتم دشمنی کا ذمہ دار ہے۔ شاید کسی دن یہ نارامن چوپائے، یہ ہزار پائے، یہ چالاک حشریات انسان اور اُس کے سارے

کارناموں کو کھا جائیں اور ان لوٹ مار کرنے والے دو پایوں، ان عجیب و غریب اور غیر فطری ہتھیاروں اور ان بے رحم قدموں سے اس سیارے کو آزاد کروا لیں۔

شکار اور ماہی گیری اقتصادی ارتقاء میں مرحلے نہیں تھے یہ متمدن معاشرے کی اعلیٰ مقام پر۔ زندہ رہنے کی سرگرمیاں تھیں۔ ایک زمانے میں وہ زندگی کا مرکز تھے اور آج بھی زندگی کی چھپی ہوئی بنیادیں ہیں۔ ہمارے ادب اور فلسفے ہماری رسومات اور فن کے پیچھے پیکنگ ٹاؤن کے مضبوط شکاری کھڑے ہیں۔ ہم دوسروں کے ذریعے شکار کرتے ہیں لیکن بچوں کے کھیلوں حتیٰ کہ لفظ کھیل میں کہ جو یا بھگوڑے شکار کا تعاقب کرنے کی تسکین بخش یادیں باقی رہتی ہیں۔ حتمی تجزیے کے اعتبار سے تہذیب خوراک کی فراہمی پر منحصر ہے۔ گرجا اور مندر، عجائب گھر اور موسیقی گاہ، لائبریری اور یونیورسٹی ان کے چہرے مہرے کے پیچھے قتل گاہیں موجود ہیں۔

شکار کے ذریعے زندہ رہنا انسانی طبع کا خاصا نہیں تھا۔ اگر انسان خود کو شکار تک ہی محدود رکھتا تو وہ فقط گوشت خور ہوتا۔ جب شکار کی غیر یقینی صورتِ حال سے باہر نکلا تو زیادہ تحفظ حاصل کر کے وہ انسان بنا اور مویشی پروری کو زیادہ تسلسل دیا۔ اس میں اسے بہت اہم فوائد حاصل تھے ـــــ جانوروں کا سدھانا، مویشیوں کی افزائشِ نسل اور دودھ کا استعمال۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کب اور کیسے جانوروں کا سدھانا شروع ہوا۔ غالباً جب جنگلی جانوروں کے بے آسرا زخمی بچوں کو مارنے سے بچا لیا گیا اور انسانی بچوں کے کھلونوں کے طور پر انہیں کیمپوں میں لایا گیا۔ جانور خوری جاری رہی لیکن اتنی جلدی نہیں۔ اس نے بار بردار جانور کا کام دیا لیکن اسے انسانی معاشرے میں گھر کے حصے کے طور پر قبول کیا گیا۔ یہ انسان کا دوست بن گیا اور اس کے ساتھ محنت اور رہائش میں شریک کار افزائش نسل کے اسرار کو

سمجھ لیا گیا اور دو قیدی بڑھ کر گلہ بن گئے۔ جانوروں کے دودھ کی بدولت عورت کو طویل شیر خواری سے نجات مل گئی۔ بچوں کی شرح اموات میں کمی ہوئی اور نئی قابلِ اعتماد غذا حاصل ہوئی۔ آبادی بڑھتی گئی، زندگی زیادہ مضبوط اور منظم ہوگئی اور زمین پر نو آباد انسان کا غلبہ زیادہ استوار ہوتا چلا گیا۔

اسی دوران عورت سب سے بڑی معاشی دریافت کر رہی تھی اور وہ زمین کی فیاضی تھی۔ جب مرد شکار پہ جاتا تو اُسے جھونپڑے کے اردگرد جو بھی قابلِ خورد شے ملتی اُسے اُٹھا لیتی۔ آسٹریلیا میں اپنے ساتھی کی عدم موجودگی میں عورت درختوں سے خوز اور پھل توڑتی۔ شہد، بیج اور قدرتی اناج اکٹھا کرتی۔ حتیٰ کہ آج بھی آسٹریلیا کے بعض قبیلوں میں جو اناج خود بخود پیدا ہوتا ہے اُسے بغیر الگ کئے اور کاٹے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ دریائے سکرامنٹو کی وادی کے انڈینز کبھی اس مرحلے سے آگے ہی نہیں بڑھے۔ ہم کبھی بھی یہ دریافت نہیں کر سکیں گے کہ انسان نے کب پہلی مرتبہ بیج کے عمل کا بغور جائزہ لیا اور بیج بونے کا سلسلہ شروع کیا۔ ایسی شروعات تاریخ کا اسرار ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن انہیں جان نہیں سکتے۔ ممکن ہے کہ جب انسان نے غلّہ اکٹھا کرنا شروع کیا ہو تو میدان اور کیمپ کے درمیان بیج گر گئے ہوں جن سے افزائش کے راز کا پتہ چلا۔ یا گندم زمین میں اکٹھے بیج پھینک دیتے تھے اور بیج اپنا راستہ خود بنا لیتے تھے۔ بورنیو کے باشندے مڑی ہوئی لاٹھی سے کھودے ہوئے سوراخوں میں بیج ڈال دیتے تھے۔ زمین کی سب سے زیادہ سادہ کاشت کا ذریعہ نوکیلی لاٹھیاں تھیں۔ قدیم مصر میں چار ہزار سال پہلے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی لاٹھیاں لئے سپاہیوں کی طرح قطار میں کھڑی عورتیں دیکھی جاسکتی تھیں جو ایک انداز سے اپنی لاٹھیوں کو زمین میں گھونپ دیتی تھیں۔ مٹی ہٹا کر بیج اندر پھینکنے کے بعد زمین ہموار کر کے ایک اور سوراخ پہ چلی جاتی تھیں۔ دوسرا

شکل کدال کے ساتھ کاشت کی تھی۔ کھودنے والی لاٹھی پر ہڈی چڑھائی جاتی اور ایک ٹکڑے کے ساتھ جوڑ دی جاتی تاکہ پاؤں کا دباؤ پڑ سکے۔ جب Conquistadores میکسیکو پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ازٹکی (Aztecs) کدال کے علاوہ کاشت کے کسی دوسرے اوزار سے واقف ہی نہ تھے۔ جانوروں کے سدھانے اور دھات کے ڈھلنے کے ساتھ زیادہ بھاری اوزار کا استعمال ممکن ہو سکا۔ کدال نے ہل کی شکل اختیار کر لی اور زیادہ گہرائی تک ہل چلانے سے زمین کی زرخیزی کا پتہ چلا جس سے انسان کا پورا مستقبل تبدیل ہو گیا۔ جنگلی پودوں کو پالا جانے لگا، نئی قسمیں پیدا کی گئیں اور پرانی قسموں کو بہتر بنایا گیا۔

فطرت نے بالآخر انسان کو پیش بینی کا فن سکھایا جو دور اندیشی اور وقت کا تصور ہے۔ پرندوں کو درختوں پر غذا جمع کرتے اور شہد کی مکھیوں کو چھتوں میں شہد جمع کرتے ہوئے دیکھ کر انسان نے طویل عرصے کی خونخواری کے بعد خوراک پس انداز کرنا سیکھا۔ وہ گوشت کو دھواں دے کر، نمک لگا کر اور ٹھنڈا رکھ کر محفوظ کرنے کے طریقے جان گیا۔ اس نے حشرات الارض، بارش اور چوروں سے غلہ محفوظ رکھنے کے لئے گودام بنائے اور خشک سالی کے دنوں کے لیئے خوراک اکٹھی کر لی۔ بتدریج یہ بات واضح ہو گئی کہ زراعت سے شکار کی نسبت خوراک کی فراہمی زیادہ بہتر اور مستقل ہو سکتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ انسان نے ان میں سے ایک قدم اٹھایا جو اُسے تہذیب کی طرف لے آیا۔ گویائی

زراعت، تشریح۔

یہ مفروضہ قائم نہیں کرنا چاہیے کہ انسان یک دم شکار سے کاشت کی طرف آیا۔ امریکی انڈینز کی طرح کئی قبائل ہمیشہ اس عبوری دور میں رہے۔ مرد شکار کرتا رہا اور عورت زمین کاشت کرتی رہی۔ نہ صرف یہ کہ یہ تبدیلی تدریج تھی بلکہ یہ کبھی بھی مکمل نہ تھی۔ انسان نے صرف خوراک حاصل کرنے کے پرانے طریقے میں نئے طریقے کا اضافہ کیا اور

اگر تاریخ کے زیادہ حصے میں دیکھا جائے تو اس نے پرانی خوراک کو نئی خوراک پر ترجیح دی۔ ہم قدیم انسان کو زمین کی ہزاروں فصلوں کا تجربہ کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ داخلی تسلی کے لئے جاننا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون سی خوراک صحیح وسالم کھائی جا سکتی ہے۔ وہ ان غذاؤں کو پھلوں اور میووں، گوشت اور مچھلی کے ساتھ ملا کر کھاتا رہا، مگر ہمیشہ شکار کی خواہش کرتا رہا۔ قدیم انسان گوشت کا بہت زیادہ شوقین ہے۔ اگر انہیں کسی تازہ مرے ہوئے جانور کی لاش ملتی تو اس کا نتیجہ ایک وحشیانہ بے اعتدالی ہوتا۔ اکثر اسے پکانے پر بھی وقت ضائع نہ کیا جاتا اور جتنی جلدی دانت اسے بھنبھوڑ سکتے اسے کچا ہی کھا لیا جاتا اور جلد ہی ہڈیوں کے سوا کچھ باقی نہ بچتا۔ پورے پورے قبیلے ہفتے تک ساحل پر پڑی ویل مچھلی پر عیش کرتے۔ اگرچہ فجی کے لوگ پکا سکتے تھے لیکن وہ کچے گوشت کو ترجیح دیتے۔ جب وہ کوئی مچھلی پکڑتے تو وہ اسے گلپھڑے کے پیچھے دانتوں سے کاٹ کر مار دیتے اور پھر کسی دوسری رسم کے بغیر سر سے دُم تک کھا جاتے۔ غذا کی غیر یقینی فراہمی نے ان فطری لوگوں کو تقریباً ہمہ خور بنا دیا تھا۔ صدفی مچھلی، سمندری چوہے، مینڈک، گھونگے، چوہے، گلہری، کیچوے، بچھو، پروانے، کھنکھورے، ٹڈی، چھاجے، چھپکلی، سانپ، اژدہے، کتے، گھوڑے، جوئیں، کیڑے، لاروے، رینگنے والے جانوروں اور پرندوں کے انڈے۔ ان میں سے ہر ایک قدیم انسان کی کبھی نہ کبھی مرغوب غذا تھی۔ بعض قبائل چیونٹیوں کے زبردست شکاری تھے اور دوسرے کیڑوں کو دھوپ میں خشک کرتے اور پھر کھانے کے لئے ان کا ذخیرہ کر لیتے۔ بعض ایک دوسرے کے بالوں سے جوئیں پکڑ کر انہیں لطف سے کھاتے۔ اگر زیادہ جوئیں اکٹھی کر لی جاتیں تو انہیں خوشی کی آوازوں کے ساتھ کھایا جاتا۔ گو یا وہ نسلِ انسانی کی دشمن ہوں۔ کم مرتبے کے شکاری قبائل کا کھانا اعلیٰ بوزنوں سے مختلف نہ تھا۔

آگ کی دریافت سے یہ درندگی گھٹ گئی اور آگ اور زراعت کی بدولت انسان شکار کے تعاقب سے آزاد ہو گیا۔ پکانے کے عمل سے ہزاروں ناقابلِ ہضم پودوں کے خام حالت کے چھوٹے خلیئے اور نشاستے کھانے کے قابل ہو سکے اور انسان زیادہ سے زیادہ اناج اور سبزیوں کی طرف رغبت حاصل کرتا گیا۔ اسی طرح پکانے سے سخت غذائیں نرم پڑ گئیں اور چبانے کی ضرورت کم رہ گئی۔ جس کے سبب دانتوں کی کمزوری شروع ہوئی جو تہذیب کی علامتوں میں سے ایک ہے۔

خوراک کی مختلف النوع اقسام میں انسان نے سب سے زیادہ لذیذ شے اپنے ہم جنس کو بھی شامل کیا۔ ایک دور میں آدم خوری عملی طور پر آفاقی تھی۔ یہ تقریباً تمام غیر متمدن قبائل حتیٰ کہ نسبتاً بعد کی قوموں مثلاً آئر لینڈ، ابیریا، پکٹ اور گیارہویں صدی کے ڈنمارک کے باشندوں میں پائی گئی ہے۔ متعدد قبیلوں میں انسانی گوشت تجارتی جنس تھا اور تدفین و تکفین کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بالائی کانگو میں زندہ مرد، عورتیں اور بچے اشیائے خوردنی کے طور پر بیچے اور خریدے جاتے تھے۔ نئے برطانیہ کے جزیرے پر انسانی گوشت دکانوں میں اس طرح بیچا جاتا تھا، جیسے ہمارے یہاں قصاب جانوروں کا گوشت بیچتے ہیں۔ بعض سلمانی جزیروں میں انسانی شکار بالخصوص عورتوں کی ضیافت اس طرح اڑائی جاتی تھی جس طرح سؤروں کی ضیافت اڑائی جاتی تھی۔ فجی کے باشندے عورتوں کو کتوں سے بہتر سمجھتے تھے کیونکہ وہ کہتے تھے "کتے سے سگِ آب کی بدبو آتی ہے۔" تہتی میں ایک بوڑھے پولینیزیہ سردار نے پیری لوٹی کو اپنی خوراک بتائی "جب کسی سفید فام کو اچھی طرح سے تلا جائے تو اُس کا مزہ پکے ہوئے کیلے کی طرح ہوتا ہے۔" تاہم فجی کے لوگوں کے خیال میں سفید فاموں کا گوشت زیادہ نمکین اور سخت تھا اور یورپی ملاح کے کھانے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی نسبت ایک پولینیزین کا گوشت زیادہ لذیذ تھا۔

اس عمل کی ابتداء کیا تھی؟ جیسے کہ پہلے فرض کیا جاتا تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رواج غذا کی کمی کی وجہ سے شروع ہوا۔ اگر ایسا ہوا تو جو ذائقہ ایک مرتبہ بن گیا وہ کمی کے باوجود قائم رہا اور ایک مرغوب میلان بن گیا۔ ہر طرف انسانی خون ایک لطافت سمجھا جاتا اسے خوفناک خیال نہیں کیا جاتا یہاں تک کہ غیر متمدن سبزی خور بھی اسے لذت سے استعمال کرتے۔ ایسے قبیلے بھی برابر انسانی خون پیتے تھے جو بصورتِ دیگر بامروّت اور فیاض تھے۔ یہ خون بعض اوقات دوا کے طور پر، بعض اوقات رسم اور اکثر اس یقین کے ساتھ پیا جاتا کہ یہ پینے والے میں مقتول کے حیات بخش خون کی قوت کا اضافہ کرے گا۔ انسانی خون کو ترجیح دینے میں کسی قسم کی شرم محسوس نہیں کی جاتی۔ غیر متمدن انسان اخلاقی طور پر انسانی گوشت اور جانور کا گوشت کھانے میں کوئی امتیاز نہیں کرتا تھا۔

میلیشیا میں جو سردار اپنے دوستوں کی بھنے ہوئے انسانی گوشت سے تواضع کرتا سماجی طور پر زیادہ محترم سمجھا جاتا تھا۔ ایک برازیلی فلسفی سردار کا کہنا تھا "جب میں نے اپنے ایک دشمن کو قتل کیا ہے تو اسے ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اسے کھا لیا جائے . . . . انسان کا کھایا جانا بُرا نہیں بلکہ اس کا مرنا بُرا ہے۔ اگر میں مار دیا جاؤں تو یہ ایک ہی بات ہے کہ میرے قبیلے کے دشمن مجھے کھاتے ہیں یا نہیں، لیکن اس سے زیادہ پُر ذائقہ کوئی اور کھیل نہیں . . . . تم سفید فام بہت زیادہ خوش ذائقہ ہوتے ہو۔"

بلاشبہ اس رسم کے کچھ سماجی فائدے بھی تھے۔ یہ ڈین سوفٹ کے منصوبے، فالتو بچوں کے استعمال، کی پیش بینی کرتا تھا اور بوڑھوں کو مفید طریقے سے مرنے کا موقع مہیا کرتا تھا۔ یہ ایک نقطۂ نظر ہے جس سے تجہیز و تکفین ایک غیر ضروری تجاوز لگتا ہے۔ مونٹین کے نزدیک انسان کو نیکی کے پردے میں موت کی اذیت دینا اُسے بھون کر کھا لینے سے زیادہ اذیت ناک عمل ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے فریبوں کا احترام کرنا چاہیئے۔

II صنعت کی بنیادیں

اگر آدمیت کی ابتداء گفتار سے اور تمدن کی زراعت کے ساتھ ہوئی ہے تو صنعت کی ابتداء آگ سے ہوئی۔ انسان نے اسے ایجاد نہیں کیا۔ غالباً فطرت نے اُس کے لئے پتوں یا ٹہنیوں کی رگڑ، آسمانی بجلی یا کیمیائی چیزوں کے اتصال سے یہ معجزہ سرانجام دیا۔ انسان کے پاس فقط فطرت کی نقل کرنے اور اسے بہتر بنانے کی مہارت تھی۔ اس نے اس حیران کن ایجاد کے ہزاروں استعمال کئے۔ سب سے پہلے اُس نے اس سے روشنی کا کام لیا تاکہ اپنے خوفناک دشمن اندھیرے پر قابو پا سکے۔ پھر اس نے اسے حرارت کے لئے استعمال کیا اور اپنے آبائی خطوں سے کم کمزور بنانے والے خطوں کی طرف گیا اور آہستہ آہستہ اس سیارے کو انسانی بناتا گیا۔ پھر اُس نے آگ کو دھاتوں پر استعمال کرتے ہوئے انہیں نرم کیا، مضبوط اور لچکیلی شکلوں میں ڈھالا۔ آگ اتنی مہربان اور عجیب چیز تھی کہ غیر متمدن انسان کے لئے ایک معجزہ رہی۔ انسان اس کی دیوتا کی طرح پوجا کرتا رہا، اسے ان گنت قربانیاں پیش کیں اور اسے اپنی زندگی اور گھر کا مرکز بنایا۔ خانہ بدوشی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اسے حفاظت سے لئے پھرتا رہا اور آسانی سے بجھنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ اہلِ روم اُس پاک دامن دوشیزہ کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے جو مقدس آگ کو بجھا دیتی۔

شکار، گلہ بانی اور زراعت کے بین بین ایجادات ہو رہی تھیں اور قدیم ذہن زندگی کی معاشی الجھنوں کا میکانکی حل تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا۔ شروع میں انسان فطرت کی پیش کشوں ـــــ زمین کا پھل بطور غذا، جانوروں کی کھال اور فر بطور پوشاک اور پہاڑوں میں غار بطور رہائش ـــــ سے مطمئن تھا۔ پھر غالباً (کیونکہ زیادہ تاریخ اندازہ ہے اور باقی تعصب) اُس نے اوزار بنائے اور جانوروں کی محنت کی نقل کی۔

اُس نے بندر کو اپنے دشمنوں پر پتھر اور پھل پھینکتے دیکھا یا پتھر کے ساتھ میوے گراتے ہوئے۔ سنجاب کو ڈیم بناتے، پرندوں کو گھونسلے اور بوزنوں کو جھونپڑے کھڑے کرتے دیکھا۔ اُس نے ان کے پنجوں، دانتوں اور سینگوں کی قوت اور ان کی کھال کی سختی پر رشک کیا۔ اُس نے ایسے اوزار اور ہتھیار بنانے شروع کر دیئے جو ان جیسے اور ان کے مقابلے کے ہوں۔ بقول فرینکلن "انسان اوزار استعمال کرنے والا جانور ہے"۔ لیکن دیگر امتیازات کی طرح یہ بھی صرف درجے کا فرق ہے۔

کئی اوزار انسان کے اردگرد پائی جانے والی پودوں کی دنیا سے متشکل ہوئے۔ بانس سے اس نے اوزار کے دستے، چاقو، سوئیاں اور بوتلیں بنائیں۔ شاخوں سے اُس نے چمٹا ہستی اور زنبور بنائے۔ چھال اور ریشے سے اُس نے رسی اور سینکڑوں قسم کا کپڑا بنایا۔ اس سے زیادہ اُس نے اپنے لئے لاٹھی بنائی۔ یہ ایک معمولی ایجاد تھی لیکن اس کے استعمالات اتنے مختلف تھے کہ انسان نے اسے ہمیشہ طاقت اور قوت کی علامت جانا۔ پریوں کی چھڑی اور گڈریے کے سونٹے سے موسیٰ کے عصا، رومی کونسل کی ہاتھی دانت کی چھڑی اور مجسٹریٹ اور بادشاہ کے چوب تک، زراعت میں لاٹھی کدال بن گئی۔ جنگ میں یہ بھالا، نیزہ، تلوار اور سنگین بن گئی۔ انسان نے معدنی دولت کو استعمال کیا اور پتھروں کو ہتھیاروں اور اوزاروں میں تبدیل کیا۔ ہتھوڑے، اہرن، تیر کے سرے، آریاں، پھانا، لیور، کلہاڑیاں اور برمے۔ جانوروں کی دنیا سے اُس نے ڈوئی چمچے ظروف، پلیٹیں، پیالے، اُسترے اور چھرے بنائے۔ سخت یا نرم اوزار سینگوں یا ہاتھی دانتوں اور ہڈیوں اور جانوروں کے بالوں اور کھالوں سے بنائے گئے۔ ان میں زیادہ تر چیزوں کے دستے لکڑی کے تھے جوان کے ساتھ بڑی ہوشیاری سے جوڑے گئے تھے۔ یہ ریشے کی مینڈھی یا جانوروں کی نسوں کی رسی کے ساتھ بندھے ہوتے اور بعض اوقات خون کے بنے ہوئے عجیب

قسم کے آمیزے سے چپکے ہوتے، قدیم انسان کی سیک فہمی اوسط جدید انسان کے برابر یا غالباً اس سے زیادہ تھی، ہم ان سے علم کے معاشرتی اضافے، مادی ذرائع اور اوزاروں میں مختلف ہیں۔ ذہن کی خلقی برتری کی وجہ سے مختلف نہیں ہیں۔ بے شک فطری انسان کسی صورتِ حال کے لوازم پر مخترع فراست سے قابو پاتا تھا۔ اسکیموز کا پسندیدہ کھیل بے سروسامانی کی حالت میں الگ تھلگ علاقوں میں جاکر ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جاتا تھا۔

یہ قدیم مہارت بُنائی کے فن میں پوری آن بان سے ظاہر ہوئی یہاں بھی جانور نے انسان کی رہنمائی کی، مکڑی کے جالوں، پرندوں کے گھونسلوں، درختوں پر ریشوں اور پتوں کی قدرتی کشیدہ کاری نے ایسے نمونے پیش کئے کہ بنائی غالباً نسلِ انسانی کے سب سے ابتدائی فنون میں سے ایک ہے۔ چھال، پتوں اور گھاس کے ریشوں سے اس طرح کپڑا، غالیچے اور قالین بنائے گئے کہ آج ہم عصر مشینی ذرائع کے باوجود ان کی ہمسری نہیں کی جا سکتی۔ الیسطیہ کی عورت ایک پوشاک بنانے میں ایک سال لگا دیتی تھی۔ شمالی امریکی انڈینز کے بنائے ہوئے کمبل اور لباس کی آرائش کشیدہ کاری اور جھالر لگا کر کی جاتی، انہیں خوبصورت رنگوں میں رنگا جاتا اور فادر تھیوڈور کے بقول "یہ رنگ اتنے اُجلے ہوتے کہ ہمارے ہاں کے رنگ ان کے قریب تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ فن وہاں سے شروع ہوا جہاں سے فطرت رخصت ہوئی، پرندوں اور مچھلیوں کی ہڈیوں اور بانس کے درخت کی نازک شاخوں سے سوئیاں بنائی گئیں، جانوروں کے پٹھوں سے دھاگا بنا گیا جو اتنا باریک تھا کہ آج کی عمدہ ترین سوئی کے ناکے سے گزر سکتا تھا۔ درخت کی چھال کو کوٹ کر چٹائی اور کپڑے بنائے جاتے، کھالوں سے کپڑے اور جوتے بنائے جاتے، ریشے سے مضبوط دھاگا اور شاخوں سے خوبصورت ٹوکریاں بنائی جاتیں جو جدید ترین نمونوں

سے خوبصورت تھیں۔

برتن سازی کا فن غالباً ٹوکری سازی ہی سے پیدا ہوا۔ مٹی کو جعفری پر رکھ دیا جاتا تاکہ موخرالذکر جل نہ جائے۔ سخت ہونے کے بعد جعفری ہٹا لی جاتی۔ یہ پہلا مرحلہ تھا جس نے بعد میں ظروف چینی میں تکمیل پائی یا غالباً مٹی کے بعض ٹکڑوں کو دھوپ میں سکھایا جاتا جس سے کوزہ گری کا فن سامنے آیا۔ آگ میں برتن کا پکانا دھوپ میں سکھانے سے اگلا قدم تھا۔ یوں ہر طرح کے استعمال کھانے، گودام کے لئے، حمل و نقل اور بالآخر آرائش و زیبائش کے لئے مٹی سے مختلف شکل کے برتن بنائے جانے لگے۔ گیلی مٹی پر انگلیوں کے ناخنوں یا اوزار سے جو نمونے نقش کئے گئے وہ آرٹ کی ابتدائی شکلیں تھیں اور غالباً تحریر کی ابتداء میں سے ایک تھیں۔

دھوپ میں خشک کی ہوئی مٹی سے قدیم قبائل اینٹیں بناتے اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مٹی کے برتنوں کے زمانے میں رہتے تھے۔ لیکن یہ فنِ تعمیر میں بعد کا مرحلہ تھا۔ جس کا ارتقائی سلسلہ "غیر متمدن" لوگوں کے گارے کے جھونپڑوں سے نینوا اور بابل کے خوبصورت ٹائیلوں تک جاری رہتا ہے۔ بعض قدیم قوموں مثلاً سیلون کے ویدہوں کے پاس کوئی مسکن نہیں تھا وہ زمین اور آسمان ہی سے مطمئن تھے۔ بعض قومیں تسمانیوں کی طرح کھوکھلے درختوں کے تنوں میں سوتی تھیں۔ بعض نیو ساؤتھ ویلز کے باشندوں کی طرح غاروں میں رہتے۔ کچھ جنگلی لوگوں کی طرح طوفانوں سے بچنے کے لئے شاخوں کے ساتھ مسکن بنا لیتے یا زمین کھود کر اسے درختوں کی شاخوں سے ڈھانپ دیتے تھے۔ ان پناہ گاہوں کے ساتھ جب اطراف کا اضافہ کیا جاتا تو جھونپڑا بن جاتا۔ اس قسم کے جھونپڑے ہمیشہ سے آسٹریلیا کے باشندوں کے استعمال میں رہے ہے۔ ان شاخوں گھاس پھونس اور مٹی کے بنے ہوئے جھونپڑوں میں دو یا تین انسان آ سکتے تھے سب سے بڑے جھونپڑے کی گنجائش تیس یا اس سے زیادہ افراد تھے۔ خانہ بدوش، شکاری

یا غلہ بان تنبو کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ اسے وہاں تک لے جایا جا سکتا تھا۔ جہاں تک شکار کا پیچھا کرنا مقصود ہوتا۔ امریکی انڈینز کی طرح کے زیادہ فطری لوگ لکڑی کے جھونپڑے بناتے تھے۔ مثلاً ایروکیس (Iroquois) پانچ سو فٹ لمبی لکڑی کی حویلیاں بناتے جس میں بہت سے خاندان رہتے تھے۔ اوشیانا کے باشندے احتیاط سے کٹے ہوئے تختوں کے گھر بناتے تھے۔ اس طرح لکڑی کا گھر بنانے کا ارتقاء مکمل ہوا۔ غیر متمدن انسان کو معاشی تمدن کے لوازمات پورے کرنے کے لئے فقط تین مرحلوں کی مزید ضرورت تھی۔ ذرائع حمل و نقل کا نظام، تجارت کا عمل اور تبادلے کے ذرائع، جدید جہاز سے سامان اُٹھائے ہوئے قُلی حمل و نقل کی تاریخ کی ابتدائی اور جدید ترین منازل دونوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ شروع میں بلاشبہ انسان اپنی شادی کے ہونے تک بار برداری کا جانور خود ہی تھا۔ آج تک جنوبی اور مشرقی ایشیا میں انسان ہی ویگن ہے اور انسان ہی گدھا۔ تب اُس نے رسیاں، لیور اور چرخی ایجاد کی۔ اُس نے جانور کو مفتوح کیا اور بوجھ لادا۔ اُس نے پہلی برف گاڑی بنائی جسے اُس کے جانور کھینچتے تھے اور بڑی بڑی شاخیں اُس کے سامان کو اُٹھائے ہوتی تھیں۔ اُس نے لکڑی کے بھاری ٹکڑوں کو گاڑی کے رولر کے طور پر استعمال کیا، اُس نے لکڑی کے اس بھاری ٹکڑے کو گول کر کے کاٹا اور 'پہیہ' کی صورت میں سب سے اہم میکانکی ایجاد عمل میں آئی۔ اس نے گاڑی کے نیچے پہیہ لگا کر چھکڑا بنا لیا۔ اس نے کچھ لکڑی کے ٹکڑوں کو تختوں کے طور پر آپس میں جوڑا، یوں دریاؤں میں نقل و حمل آسان ہو گئی۔ خشکی پر اُس نے مشکل گزار علاقوں اور پہاڑوں پگڈنڈیوں اور آخر میں سڑکوں کا سفر کیا، اس نے ستاروں کا مطالعہ کیا اور آسمان پر اُن کا راستہ دیکھتے ہوئے اپنے کارواں کی رہنمائی کی۔ وہ پیدل چلا، کشتی رانی کی، ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے،

ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک بہادری سے سفر کیا اور سمندروں کے ذریعے اپنے کلچر کو پھیلایا۔ یہاں بھی تحریری تاریخ کے شروع ہونے سے پہلے بڑے بڑے مسائل حل کر لئے گئے تھے۔

چونکہ انسانی ہنر اور قدرتی ذرائع مختلف طریقوں اور نامساوی طور پر تقسیم ہوئے ہیں لہذا کوئی قوم اپنی مخصوص قابلیت کی ترقی اور ضروری اسباب سے قرابت کے سبب اس قابل ہو سکتی ہے کہ بعض اشیاء اپنے پڑوسیوں سے زیادہ سستی پیدا کر سکے۔ اپنی ضرورت سے زیادہ اس قسم کی اشیاء پیدا کر کے وہ دوسری قوموں کو تبادلے کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اس طرح تجارت کی ابتداء ہوئی۔ کولمبیا کے چبچہ انڈینیز (Chibcha Indians) اپنے علاقے میں بکثرت پایا جانے والا پہاڑی نمک برآمد کرتے تھے اور اس کے بدلے ایسا اناج درآمد کرتے تھے جو ان کی بنجر زمین پر نہیں اُگ سکتا تھا۔ بعض امریکی انڈینیز دیہات صرف تیر بناتے تھے بنوگیانا میں برتن سازی ہوتی، افریقہ کے بعض ممالک میں لوہار کا کام ہوتا یا کشتیاں اور بھالے بنتے تھے۔ ایسے ماہر قبیلے یا دیہات اپنی صنعت کا نام حاصل کر لیتے تھے (سمتھ، فشر، پوٹر) اور وقت کے ساتھ یہ نام ماہر خاندانوں کے ساتھ لگ جاتا تھا۔ زائد پیداوار کی تجارت پہلے پہل تحائف کے تبادلے سے شروع ہوئی، یہاں تک کہ ہمارے تجارتی عہد میں ایک تجارتی تحفہ تجارت کو شروع کرتا یا ختم کر دیتا ہے۔ جنگ، ڈاکے خراج، جرمانے اور تاوان سے تبادلہ آسان ہوا۔ اس طرح اشیاء حرکت میں رہیں۔ رفتہ رفتہ مبادلے کا ایک منظم نظام ترقی پا گیا اور خاص موقع، خاص عرصے کے لئے مستقل چونگیاں منڈیاں اور بازار قائم ہو گئے۔ جہاں جس کسی کے پاس کوئی زائد شے ہوتی وہ اسے اپنی ضرورت کی چیز سے بدل لیتا۔

ایک طویل مدت تک تجارت ایسا ہی تبادلہ رہا۔ صدیوں کے بعد تجارت

کو تیز کرنے کے لئے قدرِ مبادلہ کا گردشی آلہ ایجاد کیا گیا۔ ایک ڈیاک موم کا گولہ ہاتھ میں لئے کئی دنوں تک بازار میں گاہک کی تلاش میں پھرتا دکھائی دیتا تاکہ وہ اُسے بدلے میں مفید اور کارآمد شے دے سکے۔ سب سے ابتدائی آلاتِ مبادلہ ایسی اشیاء تھیں جن کی طلب ہمہ گیر تھی جو قیمت ادا کر کے کوئی بھی خرید لیتا۔ کھجوریں، نمک، کھالیں، فر، زیورات، اوزار، ہتھیار۔ ایسی تجارت میں ایک جوڑا لمبی جرابیں، ایک چاقو کے برابر تین چاقو، ایک کمبل کے برابر، چار چاقو ایک بندوق کے برابر، پانچ ایک گھوڑے کے برابر تھے۔ بارہ سنگھے یک دو دانت ایک ٹٹو کے برابر اور آٹھ ٹٹو ایک بیوی کے برابر تھے کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جسے کسی نہ کسی قوم نے دولت کے طور پر استعمال نہ کیا ہو۔ مچھلیاں، مچھلی پکڑنے کا کانٹا، موتی، منکے، کوکو (سفوف) بیج، چائے، مرچ۔ بعد میں بھیڑیں، سور، گائیں اور غلام۔ شکاریوں اور گلہ بانوں کے درمیان مویشی قدر کا آسان معیار اور آسان آلۂ مبادلہ تھے۔ ان میں دلچسپی نسل افزائی کے باعث تھی، انہیں ساتھ لے جانا آسان تھا کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو لے جا سکتے تھے۔ حتیٰ کہ ہومر کے زمانے میں انسانوں اور اشیاء کی قیمت مویشیوں سے ادا کی جاتی۔ دائیومید کی زرہ بکتر نو مویشیوں کے برابر تھی جبکہ ایک ہنرمند غلام چار مویشیوں کے برابر تھا۔ اہلِ روم مویشیوں اور دولت کے لئے محبت آمیز الفاظ بالترتیب Pecus اور Pecunia استعمال کرتے تھے، انھوں نے اپنے ابتدائی سکوں پہ بیل کی شکل بنا رکھی تھی۔ انگریزی زبان کے الفاظ Capital، Chattle اور Cattle فرانسیسی زبان کے ذریعے لاطینی زبان کے لفظ Capitale تک جاتے ہیں جس کا معنی ملکیت (جائیداد) کے ہیں اور یہ لفظ ایک اور لفظ Caput سے ماخوذ ہے جس کا مطلب Head یعنی مویشی ہے۔ جب دھات کو ڈھال لیا گیا تو یہ بتدریج دوسری اشیاء کی جگہ معیارِ قدر بن گئی ـــــ تانبا، کانسی، لوہا۔ بعدازاں زیادہ مالیت کو کم

حجم اور وزن میں آسانی سے پیش کرنے کے لئے چاندی اور سونا انسان کی دولت بن گئے۔ علامتی اشیاء سے دھات کی کرنسی تک پیش رفت غیر متمدن انسان کا کارنامہ نہیں، سکہ سازی اور اعتباری زر تاریخی تمدن کی ایجاد ہیں۔ یوں نمائدہ پیداوار کے تبادلے کو انسان کی دولت اور آسائش میں اضافہ کی خاطر مزید آسان بنایا گیا۔

III معاشی تنظیم

تجارت نے غیر متمدن دنیا کو درہم برہم کر کے رکھ دیا کیونکہ اس کے خروج ہونے سے دولت اور منافع کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے ملکیت کا تصور نہیں تھا لہذا حکومت بھی نہیں تھی۔ معاشی ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں ملکیت زیادہ تر ذاتی استعمال کی اشیاء تک محدود تھی۔ ایسی اشیاء (جن میں بیوی بھی شامل ہے) کے ساتھ ملکیت کا ایسا تصور وابستہ تھا کہ انہیں ان کے مالک کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ اس کا اطلاق ایسی چیزوں پر بہت کم ہوتا تھا جو ذاتی استعمال میں نہیں تھیں۔ ان کے معاملے میں ملکیت کا تصور مسلسل تعلیم کا متقاضی تھا۔ غیر متمدن لوگوں میں تقریباً ہر طرف زمین کیمونٹی کی ملکیت ہوتی تھی۔ شمالی امریکی انڈینز، پیرو کے باشندے، انڈیا (بنگلہ دیش کے چٹاگانگ) پہاڑی قبیلے اہلِ بورینا اور جنوبی سمندری جزیروں کے باسی مشترکہ طور پر زمین کی ملکیت رکھتے، اسے کاشت کرتے اور اس کی فصل میں مل کر شریک ہوتے تھے۔ اوماہا انڈینز کہتے تھے زمین پانی اور ہوا کی طرح ہے جو فروخت نہیں کی جا سکتی۔ سفید فاموں کی آمد سے قبل سموآ میں زمین بیچنے کا تصور ناپید تھا۔ پروفیسر ریورز نے میلنیشیا اور پولی نیشیا میں زمین کی اشتراکیت دیکھی اور اندرونی لیبریا میں یہ آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

خوراک میں اشتراکیت کم رہی۔ غیر متمدن لوگوں میں یہ بات عام تھی کہ جن کے پاس خوراک ہوتی وہ ان لوگوں کو شریک کرتے جن کے پاس خوراک نہیں ہوتی۔ اسی طرح مسافر اپنے راستے میں جو گھر پسند کرتا وہاں رُک جاتا اور کھا پی لیتا، جو لوگ قحط کا شکار ہو جاتے اُن کے ہمسائے انہیں خوراک مہیا کرتے۔ اگر کوئی شخص جنگل میں کچھ کھانے بیٹھتا تو وہ باآوازِ بلند پکارتا کہ اگر کوئی دوسرا موجود ہے تو وہ آئے اور اس کے ساتھ شرکت کرے۔ جب ٹرنر نے سموآ کے ایک باشندے کو لندن کے غریبوں کے متعلق بتایا تو اس "غیر متمدن" نے حیرانی سے پوچھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ غذا نہیں؟ دوست نہیں؟ رہنے کو گھر نہیں؟ وہ کیسے بڑا ہوا؟ اُس کے دوستوں کے گھر نہیں؟ کسی بھوکے ہندوستانی کو کہنے کی دیر تھی، کھانا خواہ کتنا ہی کم ہو اُسے اگر ضرورت پڑتی تو مل جاتا۔ کسی کو غذا کی کمی نہیں پڑ سکتی اگر شہر میں کسی بھی جگہ غلہ موجود ہے؛ ہوٹنٹوں میں یہ رواج تھا کہ جس کے پاس دوسروں سے زیادہ ہوتا وہ زائد دوسروں میں تقسیم کر دیتا، یوں سب برابر ہو جاتے۔ افریقہ میں تہذیب کی آمد سے پہلے سفید فام سیاحوں نے یہ دیکھا ہے کہ کسی سیاہ فام کو اگر کھانے یا کسی دوسری قیمتی شے کا تحفہ ملتا تو وہ اسے فوراً تقسیم کر دیتا۔ چنانچہ جب ان میں سے ایک کو کپڑوں کا سوٹ دیا گیا تو دینے والے نے تھوڑی دیر بعد ہی دیکھا کہ وصول کرنے والے نے ہیٹ پہن رکھا تھا، ایک دوسرے نے پتلون پہن رکھی تھی اور ایک دوسرے دوست نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ اسکیمو شکاری کا اپنے شکار پر انفرادی حق نہیں تھا اُسے شکار کو گاؤں کے باسیوں میں تقسیم کرنا ہوتا تھا، آلات اور دوسری اشیاء سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھیں۔ کیپٹن کارور لکھتا ہے کہ "امریکی انڈین ملکیت کے امتیازات میں ـــــ گھریلو استعمال کی اشیاء کے علاوہ ـــــ ناواقف تھے۔ وہ ایک دوسرے کے متعلق نہایت آزاد خیال اور اپنے دوستوں کی کمی کو اپنے

پاس فالتو چیزوں سے پورا کرتے تھے۔" ایک مشنری کی رپورٹ کے مطابق "ان کا آپس کا محبت اور شرافت کا برتاؤ انتہائی حیران کن تھا جو بہت تہذیب یافتہ قوموں کے عام افراد میں نہیں پایا جاتا۔ بلاشبہ یہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ ان "وحشیوں" کے لیئے "تیرا" اور "میرا" جیسے الفاظ اجنبی ہیں جو سینٹ کرائی سوسٹم Cheysostom کے مطابق ہمارے دلوں میں نیکی کی روشنی کو بجھا کر لالچ کی آگ جلا دیتے ہیں"۔ ایک اور شاہد رقمطراز ہے "میں نے انہیں شکار تقسیم کرتے دیکھا ہے۔ جب ایک ہی شکار کے بہت سے حصے بخرے کرنے ہوتے تھے لیکن کبھی انہیں اس بات پر معترض نہیں پایا کہ تقسیم غیر مساوی یا قابلِ اعتراض ہے۔ وہ خالی پیٹ سونا پسند کریں گے لیکن یہ الزام اپنے سر نہ لیں گے کہ انہوں نے ضرورت مند کی حاجت پوری نہیں کی۔ . . . وہ اپنے آپ کو ایک عظیم خاندان تصور کرتے ہیں"۔

تہذیب کی نمو کے ساتھ یہ قدیم اشتراکیت کہاں غائب ہو گئی؟ سمنر Sumner کا خیال ہے کہ اشتراکیت غیر حیاتیاتی ثابت ہوئی، جدوجہد کے راستے میں رکاوٹ بنی، اس نے ایجادی قوتوں، محنت اور بچت کو کم تحریک دی، زیادہ قابل آدمی کو اجر اور کم کو سزا دینے میں ناکامی سے اہلیت برابر ہو گئی جو ترقی اور دوسرے گروہوں سے کامیاب مقابلے کی دشمن تھی۔ لوسکیل نے بعض جنوب مشرقی ہندوستانی قبائل کے متعلق لکھا ہے، "وہ اتنے سست تھے کہ خود کچھ بھی نہ اُگاتے تھے اور اس اُمید پر بیٹھے رہتے تھے کہ دوسرے اُنہیں اپنی پیداوار میں شریک کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔ اس طرح محنتی لوگ اپنی محنت کا اتنا ہی پھل کھاتے تھے جتنا نکمے۔ نتیجتاً اُنہوں نے کم پیداوار اُگانی شروع کر دی۔ ڈارون کا خیال تھا کہ اہلِ فیوجیا کے درمیان مکمل مساوات ان کے مہذب بننے کی کسی بھی اُمید کے لیئے مہلک تھی یا اہلِ فیوجیا یہ کہتے کہ تہذیب ان کی مساوات کے لیئے مہلک تھی۔ اشتراکیت ایسے تمام لوگوں کے لیئے یقینی تحفظ

کا سبب بنی جو غیر متمدن معاشرے کی افلاس اور جہالت کی وجہ سے بیماریوں اور حادثوں سے بچ جاتے تھے لیکن یہ انہیں افلاس سے نہ نکال سکی۔ انفرادیت اپنے جلو میں دولت لائی لیکن یہ عدم تحفظ اور غلامی بھی لائی۔ اس نے بہتر انسانوں کی پوشیدہ قوتوں کو اُجاگر کیا لیکن زندگی کے مقابلے کو شدید کر دیا اور انسان کو ایسے شدید افلاس کا احساس ہوا جو اُس وقت نہیں تھا جب سب مل کر کھاتے تھے اور کسی پر ظلم نہیں ہوتا تھا۔

اشتراکیت زیادہ سہولت سے ایسے معاشروں میں باقی رہ سکی۔ جہاں انسان ہمیشہ حرکت میں رہتے تھے اور خطرہ اور قلت ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ شکاریوں اور غلہ بانوں کو زمین کی ذاتی ملکیت کی ضرورت نہیں تھی، لیکن جونہی زراعت انسان کی زندگی کا باقاعدہ حصہ بن گئی تو اس بات کا احساس پیدا ہوا کہ زمین کی کاشت اُسی وقت بارآور ہوگی جب اس کی محنت کا اجر اُس خاندان کو ملے جس نے اسے کاشت کیا ہے۔ چنانچہ اداروں اور تصورات، نظاموں اور گروہوں کے فطری انتخاب کے نتیجے میں شکار سے زراعت تک کا سفر قبائلی ملکیت سے خاندانی ملکیت میں تبدیل ہو گیا۔ پیداوار کا سب سے کفایتی ادارہ ملکیت کا ادارہ بن گیا۔ جوں جوں خاندان پدرسری شکل اختیار کرتا گیا اور خاندان کا اختیار سب سے بڑے بزرگ مرد کے ہاتھوں میں چلا گیا تو ملکیت زیادہ سے زیادہ انفرادی ہوتی گئی اور شخصی ترکے کا آغاز ہوا۔ اکثر کوئی مہم جو فرد گھر کو چھوڑ کر روایتی سرحدوں سے باہر نکل جاتا اور سخت محنت سے جنگل میں زمین ہموار کرتا، اُس کی حفاظت کرتا اور اُسے اپنی ملکیت سمجھتا یہاں تک کہ معاشرہ اُس کے اس حق کو تسلیم کر لیتا۔ یوں انفرادی ملکیت کی ایک اور شکل سامنے آئی۔ جوں جوں آبادی کا دباؤ بڑھتا گیا اور پُرانی زمین ختم ہوتی گئی۔ زمین کی نئی کاشت وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی یہاں تک کہ مخلوط

معاشروں میں انفرادی ملکیت وقت کی ضرورت بن گئی۔ زر کی ایجاد سے ان عوامل کو مدد ملی اس سے جائیداد اکٹھی کرنا اور منتقل کرنا آسان ہو گیا۔ دیہی کمیونٹی یا بادشاہ کی زمین کی تکنیکی ملکیت اور اس کی معیاری تقسیم تو میں پرانے قبائلی حقوق اور روایات نے خود کو دوبارہ قائم کیا لیکن پرانے اور نئے نظام میں قدرتی ارتعاش کے ایک عرصے بعد ذاتی ملکیت نے مکمل طور پر خود کو تاریخی معاشرے کا بنیادی معاشی ادارہ منوالیا۔

زراعت جو تمدن پیدا کر رہی تھی نہ صرف ذاتی ملکیت بلکہ غلامی کا موجب بنا۔ خالص شکار کے عہد میں غلامی موجود نہیں تھی۔ شکاری کے بیوی، بچے گھریلو کام کاج کے لئے کافی تھے۔ مرد شکار یا جنگ میں معروف رہتے یا شکم سیری کی کاہلی میں پڑے رہتے۔ غیر مہذب لوگوں کی مخصوص کاہلی لڑائی یا شکار کی تھکاوٹ سے بتدریج جانبری کی عادت کی بدولت تھی۔ یہ کاہلی کی نسبت آرام زیادہ تھی۔ تشنیج کی اس کیفیت کو باقاعدہ کام میں ڈھالنے کے لئے دو چیزیں ضروری تھیں۔ کاشت کاری کا معمول اور محنت کی تنظیم۔ جہاں لوگ اپنے لئے کام کرتے ہیں ایسی تنظیم ڈھیلی ڈھالی اور طبع زاد رہتی ہے۔ جہاں وہ دوسروں کے لئے کام کرتے ہیں محنت کی تنظیم حتمی طور پر طاقت پر انحصار کرتی ہے۔ زراعت کے فروغ اور انسانی نابرابری کی وجہ سے معاشرتی طور پر کمزور لوگ طاقتور لوگوں کے کام میں لگ گئے۔ اس وقت فاتح کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ایک زندہ انسان اچھا قیدی ہے۔ انسانوں کا قتل عام اور آدم خوری کم ہو گئی اور غلامی میں اضافہ ہو گیا۔ جب انسانوں نے اپنے ہم جنسوں کو قتل کرنا یا کھانا چھوڑ دیا اور صرف انہیں غلام بنایا اُس وقت یہ ایک بہت بڑی اخلاقی اصلاح تھی۔ وسیع پیمانے پر ایسی ہی صورتِ حال آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جب ایک قوم جنگ میں فتح حاصل کرتی ہے تو فاتح قوم مفتوح کو ختم کرنے کی بجائے تاوان کے طور پر اُسے غلام بنا لیتی ہے۔ جب ایک مرتبہ غلامی وجود میں آگئی اور سود مند

ثابت ہوئی تو اسے عہد شکن قرض واروں اور ہٹ دھرم مجرموں تک پھیلا دیا گیا اور غلاموں کو پکڑنے کے لئے یورشیں کی گئیں۔ جنگ سے غلامی وجود میں آئی اور غلامی نے جنگ کو پیدا کیا۔

غالباً صدیوں کی غلامی کی وجہ سے ہماری نسل نے جانفشانی کی روایات اور عادات پیدا کیں۔ جسمانی، معاشی یا سماجی تعزیر سے گذرے بغیر مشکل اور دیرپا کام نہیں ہو سکتا۔ غلامی اُس نظم و ضبط کا حصہ بن گئی۔ جس کی بدولت انسان محنت کے لئے تیار ہوا۔ بالواسطہ اس نے تمدن کو فروغ دیا کیونکہ اس نے دولت میں اضافہ کیا اور اقلیت کے لئے فراغت پیدا کی۔ کچھ صدیوں بعد لوگوں نے اسے تسلیم کر لیا۔ ارسطو نے غلامی کو ناگزیر اور فطری قرار دیا۔ سینٹ پال نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ غالباً اُس کے عہد میں غلامی خدا کی طرف سے معین کردہ ادارہ بن چکا تھا۔

زراعت، غلامی، محنت کی تقسیم اور موروثی انسانی تفاوت کے سبب فطری معاشرے کی تقابلی برابری بتدریج عدم مساوات اور طبقاتی تقسیم میں بدل گئی۔ "غیر متمدن گروہ میں ہم اصولی طور پر غلام اور آزاد میں کوئی تفریق نہیں پاتے۔ نا ہی غلامی، ذات پات، سردار اور رعایا میں کوئی امتیاز موجود ہے۔" رفتہ رفتہ اوزاروں اور تجارت کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے غیر ہنرمند اور کمزوروں کو ہنرمند اور طاقتوروں کا غلام بنا دیا۔ ہر نئی ایجاد طاقتوروں کے ہاتھ میں نیا ہتھیار تھی جس نے کمزوروں پر غلبہ پانے اور ان کے مزید استحصال میں طاقتوروں کی مدد کی۔ وراثت نے جائیداد میں اضافے کا اعلیٰ موقع پیدا کیا اور ایک عہد کے متجانس معاشرے کو طبقات اور ذات پات میں تقسیم کر دیا۔ امیر اور غریب بڑی امارت اور غربت کے متعلق باشعور ہوتے گئے، طبقاتی جنگ ساری تاریخ در میان ایک سُرخ لکیر بنتی گئی اور ریاست، طبقات کو منضبط کرنے،

کو تحفظ فراہم کرنے، جنگ کرنے اور امن قائم کرنے کے لئے ناگزیر آلۂ کار کے طور پر سامنے آئی۔

تیسرا باب

تہذیب کے سیاسی عوامل

حکومت کی ابتداء

انسان شوق سے سیاسی جانور نہیں ہے۔ انسانی نر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی خواہش سے نہیں بلکہ عادت، تقلید اور حالات کی مجبوری کے باعث جُڑتا ہے۔ وہ معاشرے سے اس قدر پیار نہیں کرتا جتنا وہ اپنی تنہائی سے ڈرتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اس لیے ملتا ہے کہ تعزید اُسے خطرے میں ڈال دیتی ہے اور بہت سے ایسے کام ہیں جو تنہائی کی بہ نسبت مل کر اچھے طریقے سے کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے اندرون میں وہ ایک تنہا انسان ہے جیسے دنیا کے ساتھ بھڑا دیا گیا ہے۔ اگر اوسط انسان کے پاس اپنا کوئی راستہ ہوتا تو شاید ہی کوئی ریاست ہوتی۔ وہ آج بھی اس کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور اس حکومت کا متمنی ہے جو کم سے کم حکمرانی کرتی ہو۔ اگر وہ زیادہ سے زیادہ قوانین کا مطالبہ کرتا ہے تو اس لیے کہ اُسے یقین ہے کہ اُس کے ہمسایوں کو اس کی ضرورت ہے۔ ذاتی طور پر وہ ایک غیر فلسفیانہ مزاجی ہے اور اپنے معاملے میں قوانین کو فضول سمجھتا ہے۔

سیدھے سادے معاشروں میں حکومت نہیں ہوتی۔ غیر متمدن شکاری ضابطے کو صرف اُس وقت مانتے تھے جب وہ شکاریوں کے ٹولے میں شامل ہوتے اور ایکشن کے لیے تیار ہوتے۔ جنگلی انسان عموماً الگ تھلگ خاندانوں میں رہتے تھے،

افریقہ کے بونے اور آسٹریلیا کے سیدھے سادھے باشندے صرف عارضی طور پر سیاسی تنظیم کو تسلیم کرتے تھے اور پھر اپنے خاندانی گروہوں میں بکھر جاتے تھے۔ اہل تسمانیہ کے سردار نہیں تھے۔ قوانین نہیں تھے اور نہ ہی باقاعدہ حکومت تھی سیلون کے ویدھا خاندان رشتہ داری کے مطابق چھوٹے چھوٹے گروہ بنا لیتے تھے لیکن ان کی حکومت نہیں تھی۔ سماٹرا کے کیوبو حکمرانوں کے بغیر رہتے تھے " ہر خاندان اپنا حکمران خود ہوتا تھا۔ اہل فیوجی بارہ سے زیادہ اکٹھے نہیں رہتے تھے۔ تنکو دس عیمو سے زیادہ میں اکٹھے نہیں رہتے تھے۔ آسٹریلیا کے خانہ بدوشوں کے جرگے میں ساٹھ سے زیادہ ذی نفس نہیں ہوتے تھے۔ ایسے معاملات میں شکار جیسے مقاصد کے لئے ان میں میل جول اور تعاون ہوتا تھا وہ کسی مستقل سیاسی تنظیم کو تشکیل نہیں دیتے تھے۔

مستقل سماجی تنظیم کی سب سے ابتدائی شکل ایک جتھا تھا۔ رشتہ دار خاندانوں کا ایک گروہ جو مشترکہ زمین کے ایک ٹکڑے پر قابض تھا، جس کا ایک ہی ٹوٹم (Totem) اور ایک جیسے رواج و قوانین تھے۔ جب جتھوں کا ایک گروہ آپس میں ایک سردار کے ماتحت اکٹھا ہوتا تو ایک قبیلہ وجود میں آتا جو سٹیٹ کی راہ میں دوسرا قدم ہوتا۔ لیکن یہ ایک سست رفتار ارتقاء تھا کئی گروہوں کا کوئی سردار نہیں تھا اور بہت سارے گروہ اپنے سردار کو صرف جنگ کے وقت برداشت کرتے۔ جمہوریت جو ہمارے عہد میں ایک زوال پذیر نظام ہے۔ غیر متمدن قبائل میں بہترین شکل میں پائی جاتی تھی۔

جہاں حکومت صرف گروہ کے خاندان کے سربراہ کی ہوتی
تھی اور کوئی مطلق العنان مقتدرہ تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ ایروکیس اور ڈلاویرے
کے انڈینز (Iroquious and Delaware Indians) خاندان اور جتھے کے
نظام کے علاوہ کسی قسم کے قوانین یا پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے
سرداروں کے پاس معمولی اختیارات ہوتے تھے۔ جسے کسی وقت بھی قبیلے کے بزرگ
ختم کر سکتے تھے۔ سات افراد پر مشتمل کونسل اوماھا کے انڈینز پر حکمرانی کرتی تھی،
جو غور و فکر کے بعد کسی متفقہ سمجھوتے تک پہنچ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایروکیس
کی مشہور لیگ تھی جس کے ذریعے بہت سارے قبیلے امن و امان قائم رکھنے کے
لئے اپنے آپ کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے اور اپنے پیمان کو پورا کرتے۔ ان "غیر متمدن"
لوگوں اور جدید مملکتوں کے درمیان زیادہ بڑا فاصلہ نظر نہیں آتا جو امن قائم
کرنے کے لئے خود کو اقوامِ متحدہ کے ساتھ جوڑ لیتی ہیں۔

جنگ کی بدولت سردار، بادشاہ اور ریاست وجود میں آتے ہیں اور یہی
جنگ کو پیدا کرتے ہیں۔ سموآ میں جنگ کے دوران سردار با اختیار ہوتا تھا۔
لیکن دوسرے اوقات میں اُسے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ڈیاکوں میں
اپنے خاندان کے سربراہ کے علاوہ کسی کی حکومت نہیں ہوتی تھی۔ جنگ کی
صورت میں وہ اپنے سب سے بہادر جنگ جو کو قیادت سونپتے۔ اُس کی
سختی سے فرماں برداری کرتے لیکن جب جنگ ختم ہو جاتی تو اُسے فارغ کر دیتے۔
امن کے دنوں میں پادری یا سب سے بڑا جادوگر زیادہ با اختیار اور با اثر ہوتا
تھا۔ جب آخرکار عمومی حکومت کی شکل میں مستقل بادشاہت کا قیام ہوا
تو اکثر قبیلوں میں یہ جنگجوؤں اور پادریوں سے وجود میں آئی۔ معاشروں
پر دو قوتوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ امن میں الفاظ اور جنگ میں تلوار، قوت صرف

اس وقت استعمال ہوتی ہے جب ذہن کی صفائی کا عمل ناکام ہو جاتا ہے۔ قانون اور دیو مالا صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے ہیں یا تو یہ باہمی تعاون سے یا باری باری نسلِ انسانی کا انتظام سنبھالتے رہے ہیں۔ ہمارے اپنے عہد تک کوئی ریاست انہیں الگ نہیں کر سکی اور غالباً کل پھر وہ متحد ہو جائیں گے۔

جنگ سے ریاست کس طرح وجود میں آئی؟ یہ درست نہیں کہ انسان فطری طور پر جنگ کی طرف راغب تھا۔ بعض عاجز لوگ بڑے پُرامن ہوتے ہیں۔ اسکیمو یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کس طرح اُسی علاقے کے یورپی ایک دوسرے کا مچھلی کی طرح شکار کرتے اور ایک دوسرے کی زمین چُرا لیتے ہیں۔ وہ اپنی زمین کو مخاطب ہو کر کہتے "کتنی اچھی بات ہے کہ تم برف سے ڈھکی ہوئی ہو۔ کتنی اچھی بات ہے کہ اگر تمہاری چٹانوں میں سونا چاندی ہے جس کے لئے عیسائی اتنے حریص ہیں تو یہ اس قدر برف سے ڈھکا ہوا ہے کہ وہ انہیں حاصل نہیں کر سکتے تمہارا بنجر پن ہمیں خوش کرتا ہے اور ہمیں اذیت سے بچاتا ہے"۔ تاہم غیر مہذب زندگی جنگوں سے سُرخ تھی۔ شکاری ایسے علاقوں کے لئے جہاں شکار کی بہتات تھی، لڑے۔ گلّہ بان ایسی چراگاہوں کے لئے لڑے جہاں اُن کے مویشی آسانی سے چر سکیں۔ کاشتکار نئی نئی زمینوں کے لئے لڑے۔ یہ تمام لوگ کسی قتل کا بدلہ لینے یا اپنے نوجوانوں کو سخت بنانے اور نظم و ضبط پیدا کرنے، یا زندگی کی یکسانیت توڑنے یا خالی لوٹ مار اور آبرو ریزی کے لئے لڑے، مذہب کی خاطر بہت ہی کم لڑے۔ قتل و غارت کی حد بندی کرنے کے لئے مختلف ادارے اور رسومات تھیں۔ بعض گھنٹوں، دنوں، ہفتوں اور مہینوں کے دوران کوئی شریف "وحشی" قتل نہیں کر سکتا تھا۔ بعض منصب داروں کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعض سڑکوں منڈیوں اور پناہ گاہوں کو امن کا علاقہ قرار دیا گیا تھا اور ایروقیس کی لیگ نے

تین سو سال تک "عظیم امن" قائم رکھا۔ لیکن غیر متمدن قوموں اور گروہوں میں جنگ زیادہ تر فطری انتخاب کے لئے پسندیدہ آلۂ کار رہی۔

اس کے نتائج نامختتم تھے۔ اس نے کمزور انسانوں کے لئے سفاک موت کا کام کیا اور نسلِ انسانی کی بہادری، تشدد، ظلم، ذہانت اور ہنر کا درجہ بڑھایا۔ اس نے ایجاد کو تحریک دیا اور ایسے ہتھیار بنائے جو مفید آلات بن گئے۔ اسی طرح جنگ کی حکمت عملیاں امن کی حکمتِ عملیاں بن گئیں (کتنی ریلوے لائنیں جنگ کے لئے بچھائی گئیں مگر ان کا مصرف تجارت ٹھہرا) اس کے علاوہ جنگ نے غیر مہذب اشتراکیت اور حراجیت کو ختم کر دیا، تنظیم اور نظم و ضبط کو سامنے لائی، قیدیوں کی غلامی، طبقات کی ماتحتی اور حکومت کی ترقی کا باعث بنی۔ ملکیت ریاست کی ماں اور جنگ اس کا باپ تھی۔

ریاست

نٹشے کہتا ہے "سُرخ شکاری جانوروں کا ایک ریوڑ، فاتحین اور حکمرانوں کی ایک نسل جو اپنی تمام تر جنگلی تنظیم اور تنظیمی قوت سے کسی آبادی پر اپنے خوفناک پنجے گاڑتی ہے۔ تعداد میں بہت زیادہ اعلیٰ ہونے کے باوجود بے شکل ہوتی ہے۔ . . . یہی ریاست کا آغاز ہے۔" لیسٹر وارڈ کہتا ہے "ریاست جو قبائلی تنظیم سے مختلف صورت رکھتی ہے۔ ایک نسل کی دوسری نسل کے ہاتھوں فتح سے یہ صورت حاصل کرتی ہے۔" اوپن ہائمر کہتا ہے "ہر طرف ہم کسی جنگ جو قبیلے کو کمزور قبیلے کی سرحدیں توڑتے دیکھتے ہیں۔ وہ وہاں امراء کی حیثیت سے مقیم ہو جاتا ہے اور اپنی ریاست قائم کر لیتا ہے۔" ریٹزنہوفر کہتا ہے "تشدد وہ عامل ہے جس نے ریاست پیدا کی ہے۔" گمپلووکز کہتا ہے "ریاست فتح کا نتیجہ

ہے اور فاتحین کی بطور حکمران نسل مفتوحین پہ حکومت کا نام ہے"۔ سمنر کہتا ہے" ریاست طاقت کی پیداوار ہے اور طاقت کی بدولت قائم رہتی ہے۔"

عموماً کسی آباد زرعی گروہ کی یہ غضب ناک غلامی شکاریوں یا گلہ بانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ زراعت انسان کو صلح کُل طریقے سکھاتی ہے۔ ایک بے کیف معمول کا خوگر بنا دیتی ہے اور طویل دن کی مشقت سے تھکا دیتی ہے، ایسے لوگ دولت اکٹھی کرتے ہیں لیکن وہ جنگ کے فنون اور جذبات بھول جاتے ہیں۔ شکاری اور گلہ بان خطرے کے عادی اور خون بہانے میں مہارت رکھتے ہیں وہ جنگ کو شکار کی ایک اور شکل سمجھتے ہیں جو زیادہ خطرناک نہیں۔ جب جنگل ان کے لئے زیادہ شکار مہیا نہیں کر پاتے، چراگاہوں کی گھٹتی ہوئی تعداد کی وجہ سے مویشی کم پڑ جاتے ہیں تو وہ گاؤں کی پکی ہوئی فصلوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ آسانی سے حملے کی کوئی معقول وجہ ایجاد کر لیتے ہیں، وہ حملہ کرتے، فتح کرتے، غلام بناتے اور حکمرانی کرتے ہیں۔

ریاست ایک جدید ارتقاء ہے اور تحریر شدہ تاریخ کے وقت ظہور پذیر ہوئی۔ کیونکہ یہ سماجی تنظیم کے اصول میں تبدیلی کی پیش قیاسی کرتی ہے ــــ یک جدی رشتہ داری سے فرماں روائی تک ــــ غیر متمدن معاشروں میں اوّل الذکر کا راج تھا۔ فرماں روائی وہاں زیادہ کامیاب ہوتی ہے جہاں یہ مختلف فطری گروہوں کو نظم و ضبط اور تجارت کی سودمند وحدت میں ڈھالتی ہے۔ ایسی فتح بہت کم دیرپا ہوتی ہے بجز اُس جگہ کے جہاں ایجاد کی ترقی نے مضبوط طبقے کے ہاتھوں میں اوزار اور ہتھیار تھما دیئے ہوں جس کی بدولت وہ بغاوت کو کچل سکیں۔ دائمی فتح میں فرماں روائی کا اصول مخفی اور تقریباً لاشعوری ہو جاتا ہے۔ جن فرانسیسیوں نے ۱۷۸۹ء میں بغاوت کی بس

حقیقت سے بے خبر تھے کہ جس اشرافیہ نے اُن پر ہزار سال تک حکومت کی اور انہیں طاقت سے مفتوح کیا وہ جرمنی سے آئی تھی، اس کا احساس کیمیلی ڈیسمولنز (Camille Desmoulins) نے اُنہیں دلایا۔ وقت ہر چیز کو مقدس بنا دیتا ہے یہاں تک کہ لیٹرے کی چوری اُس کے پوتے کے ہاتھ میں مقدس جائیداد بن جاتی ہے۔ ہر ریاست کی ابتداء جبر سے ہوتی ہے لیکن تابعداری کی عادات ضمیر کا اطمینان بن جاتی ہیں اور جلد ہی ہر شہری جھنڈے کے لئے وفاداری کا اقرار کرتا ہے۔

شہری اپنی جگہ سچا ہوتا ہے کیونکہ ریاست کیسے ہی شروع ہو جلد ہی نظم و ضبط کے لئے ناگزیر سہارا بن جاتی ہے۔ جوں جوں تجارت جتھوں اور قبیلوں کو متحد کرتی ہے ایسے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں جو رشتہ داری کی بجائے اتصال پر انحصار کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں نظم و ضبط کے لئے غیر فطری اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیہی کمیونٹی مثال کے لئے پیش کی جاسکتی ہے اس نے جتھے اور قبیلے کو مقامی تنظیم کی شکل کے طور پر موقوف کر دیا اور خاندان کے سربراہوں کی منڈلی کے ذریعے سادہ اور تقریباً جمہوری حکومت بنا لی۔ لیکن ایسی کمیونٹیوں کے وجود اور تعداد نے کسی خارجی قوت کی ضرورت کو پیدا کیا جو ان کے باہمی تعلقات کو ضبط میں لاکر انہیں ایک بڑے معاشی دھارے میں باندھ سکے۔ اگرچہ ریاست ابھی ابتدائی شکل میں تھی لیکن پھر بھی اُس نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ یہ نہ صرف ایک منظم قوت بلکہ پیچیدہ معاشرے کو متشکل کرنے والے ہزارہا متحارب گروہوں کے مفادات کو ہموار کرنے کا آلۂ کار بن گئی۔ اس نے وسیع تر علاقوں میں اپنی قوت اور قانون کے پَر پُرزے پھیلائے۔ اگرچہ اس نے خارجی جنگ کو پہلے سے زیادہ تباہ کن بنا دیا

لیکن اس نے داخلی امن کو قائم رکھا۔ ریاست کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے

کہ یہ خارجی جنگ کے لئے داخلی امن کو برقرار رکھتی ہے۔ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ آپس میں لڑنے کی بجائے ٹیکس ادا کئے جائیں۔ سب کو رشوت دینے سے بہتر تھا کہ کسی بڑے لیڈر کو خراج ادا کر دیا جائے۔ حکومت کے عادی معاشرے میں عدم حکمرانیت کا مطلب کیا ہوگا اِسے ہم اہلِ بگانڈا کے ردِّعمل سے دیکھ سکتے ہیں۔ جب ان میں بادشاہ مرجاتا تو ہر ایک مسلّح ہو جاتا، لاقانونیت شروع ہو جاتی، ہر طرف خون بہایا جاتا اور لوٹ مار کی جاتی۔ سپنسر نے کہا تھا "مطلق العنان حکمرانی کے بغیر معاشرے کا ارتقاء شروع نہیں ہو سکتا تھا"

جو ریاست فقط قوت پر انحصار کرتی ہے۔ جلد ہی زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگرچہ فطری طور پر انسان دھوکا کھا سکتا ہے لیکن وہ فطری طور پر ضدی بھی ہے اور قوت ٹیکسوں کی طرح وہاں زیادہ کامیاب ہوتی ہے جہاں یہ غیر محسوس اور بالواسطہ ہو۔ چنانچہ ریاست اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے خاندان، چرچ سکول جیسے ذہنی صفائی کے آلات گھڑتی ہے تاکہ لوگوں کی روح میں حب الوطنی اور وفاداری میں فخر کا عنصر ڈال سکے۔ اس سے ہزاروں پولیس والوں کی بچت ہوئی اور ذہنِ عامہ کو اُس اطاعت پذیر انفعال کے لئے تیار کیا گیا جو جنگ کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حکمران اقلیت نے اپنی ناجائز فرمانروائی کو قانون میں بدلنے کے لئے بہت کوشش کی۔ جو اس فرمانروائی کو مضبوط بناتے ہوئے لوگوں کو تحفظ اور نظم و ضبط فراہم کرے گا اور معقول حد تک رعایا کے حقوق کو تسلیم کرے گا تاکہ وہ قانون کو قبول کریں اور ریاست کے ساتھ جُڑے رہیں۔

III۔ قانون

قانون ـــــ جائیداد، شادی اور حکومت کے ساتھ آتا ہے، سب سے نچلے درجے کے معاشرے اس کے بغیر زندگی گزارتے ہیں۔ الفریڈ رسل ویلیس لکھتا ہے "میں مشرق اور شمالی امریکہ میں غیر مہذب لوگوں کے ساتھ رہا ہوں۔ جن کے ہاں قانون یا قانونی عدالتیں نہیں ہیں۔ گاؤں کی رائے عامہ کو اظہار کے کھلے مواقع میسر ہیں، ہر انسان دوسروں کے حقوق کا لحاظ کرتا ہے اور ان حقوق سے کبھی انحراف نہیں ہوتا۔ ایسی کمیونٹی میں تقریباً سب برابر ہوتے ہیں" ہرمن میلویل جزیرہ مارکوئیزا کے باسیوں کے متعلق یہی بات لکھتا ہے "جتنا عرصہ میں تائیپس قبیلے کے لوگوں کے درمیان رہا کسی پر بھی دوسروں کو نقصان پہنچانے کے الزام میں مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ اس وادی میں ہر کام بے مثل توازن اور عمدگی کے ساتھ طے پاتا ہے۔ جس طرح عیسائیت میں اعلیٰ اور نیک انسانوں کے تعلقات ہوتے ہیں، قدیم روسی حکومت نے الیوشین کے جزیروں میں قانون کی عدالتیں قائم کیں۔ لیکن پچاس سالوں میں ان عدالتوں میں کوئی کام نہ ہوا۔ برنٹن کہتا ہے، "ایروقیس کے معاشرتی نظام میں جرائم اور خلاف ورزیاں اس قدر کم تھیں کہ ان کے ہاں کوئی تحریری قانون نہیں تھا۔ یہی مثالی صورت حال ہے جس کے لئے مزاجی ہمیشہ کڑھتا رہتا ہے۔

ان بیانات میں بعض ترامیم کی ضرورت ہے۔ فطری معاشرے نسبتاً قانون سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ قانون کی طرح سخت اور قابل حرمت رسوم کی حکمرانی میں ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تشدد کے جرائم شروع میں ذاتی معاملات سمجھے جاتے ہیں اور ذاتی انتقام کے لئے چھوڑ دیئے

جاتے ہیں۔

معاشرے کے پورے وجود کے پیچھے رواج کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سوچ اور عمل کا ٹھوس امتزاج ہوتا ہے جو قانون کی عدم موجودگی، تبدیلی اور مداخلت کے دوران معاشرے کو استقامت اور نظم و ضبط مہیا کرتا ہے۔ رواج کسی گروہ کو ایسا ہی استحکام دیتا ہے جیسا وراثت اور جبلت انواع کو دیتی ہے اور جیسا استحکام عادت فرد کو دیتی ہے۔ معمول کے مطابق عمل انسان کو عقلمند رکھتا ہے کیونکہ اگر ایسے راستے موجود نہ ہوں جن پر سوچ اور عمل لاشعوری طور پر آسانی سے حرکت کر سکیں تو ذہن ہمیشہ کے لئے متردد ہوگا اور جلد ہی دیوانگی میں پناہ لے گا۔ جبلت اور عادت، رسم اور رواج میں معیشت کا قانون کام کرتا ہے۔ خودکار ردعمل متواتر تحریک یا روایتی حالات میں سب سے سہل ردعمل ہے۔ سوچ اور تجدد باضابطگی میں خلل ہے اور انہیں ناگزیر نامطابقت کی وجہ سے برداشت کیا جاتا ہے۔

جب رواج کی اس قدرتی بنیاد میں مذہب کی طرف سے کسی مافوق الفطرت قانون کا اضافہ ہو جاتا ہے اور آباؤ اجداد کی راہ و رسم دیوتاؤں کی رضامندی بن جاتے ہیں، تب رواج قانون سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور غیر متمدن آزادی میں کافی فرق آجاتا ہے۔ قانون کی خلاف ورزی سے آدھی آبادی کی حمایت حاصل ہوتی ہے جو خفیہ طور پر ایسے لوگوں پر رشک کرتے ہیں جو اس قدیم دشمن کو نیچا دکھاتے ہیں۔ رواج کی خلاف ورزی کر کے ہمہ گیر دشمنی مول لی جاتی ہے۔ کیونکہ رواج لوگوں کے اندر سے پھوٹتا ہے جبکہ قانون ان پر باہر سے نافذ کیا جاتا ہے۔ قانون عموماً مالک کا حکم ہوتا ہے لیکن رواج عمل کے طریقوں کے وہ بقائے اصلح ہیں جنہیں گروہ کے تجربے میں بہت سہل پایا گیا۔ جب ریاست خاندان، جتھے، قبیلے اور دیہی کمیونٹی کے فطری نظام کی جگہ لے لیتی ہے۔ تو قانون جزوی طور پر رواج کی جگہ لے لیتا ہے۔ جب تحریر سامنے

آتی ہے تو قانون زیادہ بھرپور طریقے سے رواج کی جگہ لے لیتا ہے اور قوانین بزرگوں اور پادریوں کی یادداشت سے نکل کر باقاعدہ قانون سازی کا حصہ بن جاتا ہے۔ لیکن یہ تبدّل کبھی بھی مکمل نہیں ہوتا۔ انسانی اطوار کے تعین اور پرکھ میں رواج غایت ہوتی ہے ـــــ قانون کے پیچھے موجود قوت، تخت کے پیچھے قوت، انسانی زندگیوں کا حتمی حاکم۔

قانون کے ارتقاء میں پہلا مرحلہ شخصی انتقام ہے۔ غیر متمدن شخص کہتا ہے۔ "انتقام میرا ہے، میں اسے پورا کروں گا۔" زیریں کیلیفورنیا کے انڈین قبائل میں ہر شخص اپنی پولیس آپ تھا اور ایسے انتقام میں انصاف کا التزام کرتا تھا جو وہ اپنی حیثیت کے مطابق لے سکتا تھا۔ چنانچہ متعدد ابتدائی معاشروں میں زید کے ہاتھوں بکر کے قتل کا بدلہ بکر کا بیٹا زید سے لیتا تھا۔ خالص امریکی خاندانوں میں یہ مثالیں آج بھی ملتی ہیں۔ بدلے کا یہ اصول قانون کی پوری تاریخ میں موجود ہے یہ روم کے قصاص کے قانون میں نظر آتا ہے۔ حمورابی کے قانون میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے اور موسیٰ کے "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" کے مطالبے میں جھلکتا ہے اور یہ آج بھی ہمارے عہد میں بہت ساری قانونی سزاؤں کے پیچھے موجود ہے۔

جرم کو مٹانے کے لئے قانون اور تہذیب میں دوسرا قدم انتقام کے نقصان کی تلافی ہے۔ اکثر داخلی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے سردار اپنا اثر استعمال کرتا کہ انتقام پر تلے ہوئے خاندان کو خون کے بدلے خون دینے کی بجائے سونے یا سامان سے مطمئن کر دیا جائے۔ جلد ہی آنکھ، دانت، بازو یا پوری زندگی کا تاوان ادا کرنے کے لئے رقم مقرر کی گئی۔ حمورابی نے ایسی اصطلاحوں میں وسیع پیمانے پر قانون سازی کی۔ اہلِ حبشہ اس معاملے میں اتنے سخت گیر تھے کہ جب کوئی

لڑکا درخت سے گر کر اپنے ساتھی پر آن پڑتا اور وہ مرجاتا تو منصفوں کے فیصلے کے مطابق مقتول کی ماں اپنے بیٹے کو درخت پر چڑھاتی تاکہ وہ اسی طرح قاتل کی گردن پر گرے۔ نقد ادا کرنے کی صورت میں جرمانہ جنس، عمر اور مجرم اور زخمی کے مرتبے کے مطابق مختلف ہوسکتا تھا مثلاً اہلِ فجی میں ایک عام آدمی کی چھوٹی چوری کی سردار کے قتل سے زیادہ گھناؤنا جرم سمجھا جاتا تھا۔

قانون کی ساری تاریخ کے دوران جرم کی اہمیت مجرم کی حیثیت سے کم رہی۔ چونکہ یہ جرمانے انتقام کو ٹالنے کے لئے ادا کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جرائم اور نقصان کا تصفیہ کرنے کی ضرورت تھی۔ قانون کے سلسلے میں تیسرا قدم عدالتوں کا قیام تھا، سردار، بزرگ یا پادری اپنے لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے بیٹھتے۔ ایسی عدالتیں ہمیشہ فیصلوں کی عدالتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اکثر وہ رضاکارانہ تصفیے کے بورڈ کا کام دیتیں، جو جھگڑے کا کوئی دوستانہ حل نکال دیتی تھیں۔ کئی قوموں میں صدیوں تک عدالتوں سے رجوع کرنا ایک اختیاری عمل تھا۔ اس کے بعد بھی اگر مظلوم جماعت عدالتوں کے فیصلے سے غیر مطمئن ہوتی تو وہ ذاتی بدلہ لینے کے لئے آزاد تھی۔ بہت سے معاملات میں مسئلے کو حل کرنے کے لئے پرائز باکسنگ سے لے کر موت کی جنگ تک مقابلہ کیا جاتا۔ قرونِ وسطیٰ میں مقتول اس نظریے کو، کہ دیوتا مجرم کو سامنے لے آئے گا اور ابتلاء کتنی ہی ظالمانہ ہو اُس فریق کو ضرور ختم کردے گی جو بصورت دیگر قبیلے کے سکون تک کو خطرے میں ڈال دے گا۔ مسترد ہوتے ہوئے غیر متمدن ذہن ابتلاء میں پناہ لیتا۔ بعض اوقات ملزم اور مدعی کے سامنے دو پیالے رکھے جاتے جن میں سے ایک میں زہر ہوتا تھا۔ دونوں کو ایک ایک پیالہ اٹھانے کا اختیار تھا۔ خیال یہ ہوتا کہ جو فریق غلطی پر ہوگا اُسے سزا مل جائے گی تب جھگڑا ختم ہو جاتا کیونکہ دونوں فریق ابتلاء کی حقیقت پر یقین

رکھتے تھے ۔ بعض قبیلوں میں یہ رواج تھا کہ جو شخص اپنا جرم تسلیم کر لیتا وہ مدّعی کے آگے اپنی ٹانگ کر دیتا ۔ مدّعی اُس میں نیزہ گھونپ دیتا یا ملزم مدعیوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ، اور وہ اس پر نیزہ پھینکتے ۔ اگر ان سب کا نشانہ چُوک جاتا تو اُسے بے گناہ قرار دے دیا جاتا یوں معاملہ ختم ہو جاتا ۔ اس طرح کی ابتدائی صورتوں میں یہ ابتلاء موسیٰ اور حمورابی کے قوانین سے لے کر قرونِ وسطیٰ تک جاری رہی ۔ باہمی مقابلہ ـــــ جو ابتلاء ہی کی ایک صورت ہے اور جس کے متعلق مؤرخین کا خیال ہے کہ ختم ہو چکا ہے ۔ ہمارے اپنے زمانے میں بھی بحال ہو رہا ہے ۔ بعض معاملات میں غیر متمدّن اور جدید انسان میں بہت تھوڑا فرق ہے اور جتنا ان دونوں میں فرق ہے اتنی ہی مختصر تہذیب کی تاریخ ہے ۔

قانون کی ترقی میں چوتھا مرحلہ سربراہ یا ریاست کی جرائم کو روکنے اور سزا دینے کے فرض کی ابتداء ہے ۔ جرائم کو روکنے کا مرحلہ جھگڑوں کا تصفیہ کرنے اور جرم کی سزا دینے سے اگلا قدم تھا ۔ چنانچہ سربراہ نہ صرف منصف بلکہ قانون دینے والا بن جاتا ہے ، گروہ کی رسومات سے پیدا شدہ "عمومی قانون" میں "مثبت قانون" کا اضافہ ہو جاتا ہے جو حکومت کے احکامات سے پیدا ہوتا ہے ۔ ایک طرف قوانین پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ لاگو کیے جاتے ہیں ۔ ہر معاملے میں قوانین اپنے ساتھ حسب نسب کی نشانی لئے ہوتے اور اُس انتقام کے سخت نگہبان بن کر اُڑ جاتے تھے ، جنہیں وہ تبدیل کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ غیر متمدّن انسانوں کی سزائیں زیادہ ظالمانہ ہوتی تھیں کیونکہ ایسے معاشرے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے تھے ، لیکن جوں جوں معاشرتی تنظیم مضبوط ہوتی گئی سزاؤں کی شدّت میں کمی آتی گئی ۔

تہذیبی دور کے مقابلے میں قدرتی معاشرے میں فرد کے حقوق کم تھے ۔ انسان

ہر طرف پابہ سلاسل پیدا ہوا ہے اور یہ زنجیریں وراثت، ماحول، رسوم و رواج اور قانون کی صورت میں موجود ہیں۔ غیر متمدن انسان قواعد و ضوابط کے سخت جال میں زندہ رہا۔ ہزاروں رکاوٹیں اس کے عمل کو پابند بناتی رہیں۔ ہزاروں خوف اُس کے ارادے کو محدود کر دیتے تھے۔ نیوزی لینڈ کے مقامی باشندے بظاہر قوانین کے بغیر زندگی گزارتے تھے لیکن درحقیقت ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر آہنی رسوم کی حکمرانی تھی۔ غیر متغیر اور غیر متبدل رسوم بنگالی باشندوں کے اُٹھنے، بیٹھنے، سونے جاگنے کھانے پینے تک کے اطوار متعین کرتی تھیں۔ فطری معاشرے میں فرد کے الگ وجود کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ جن چیزوں کی اہمیت تھی اُن میں خاندان، جرگہ، قبیلہ اور پرگنہ شامل تھے۔ انہی کے قبضے میں زمین ہوتی اور یہی طاقت کا استعمال کرتے تھے۔ فرد اُس وقت ایک نمایاں حقیقت کے طور پر سامنے آیا جب شخصی جائیداد کے وجود میں آنے سے اُسے معاشی اختیار مل گیا اور ریاست نے اُسے قانونی مرتبہ دے کر اُس کے حقوق کو ممیز کیا۔ فطرت ـــــ جو مکاری اور طاقت کے علاوہ کسی قسم کے حقوق نہیں جانتی، انسان کو حقوق عطا نہیں کرتی۔ حقوق وہ رعایات ہیں جو کمیونٹی فرد کو اجتماع کی بھلائی کے لئے دیتی ہے۔ آزادی تحفظ کا ثمر ہے اور آزاد فرد تہذیب کی علامت اور پیداوار ہے۔

IV خاندان

بھوک اور محبت چونکہ انسان کی بنیادی ضروریات ہیں اس لئے معاشی بہم رسانی اور حیاتیاتی بقا، معاشی تنظیم کے بنیادی وظائف ٹھہرے، یوں بچوں کی مسلسل پیدائش غذا کی فراہمی کے تسلسل جتنی اہمیت کی حامل قرار پائی۔ اُن اداروں کے ساتھ جو مادی بہبود اور سیاسی نظم کا کام کرتے ہیں، معاشرہ نسلِ انسانی کے دوام کے ادارے بھی

شامل کر دیتا ہے۔ ریاست کے باقاعدہ آغاز سے پہلے جرگہ مختلف جتھوں اور نسلوں کے درمیان تعلقات کو باضابطہ بنانے کا نازک کام کرتا ہے حتیٰ کہ ریاست کے معاشرتی نظم و نسق کے لئے مرکزی اور مستقل ذریعہ بننے کے باوجود نسلِ انسانی کی لازمی حکومت سب سے اہم تاریخی ادارے ـــــ خاندان ـــــ میں رہتی ہے۔

یہ بات خاصی بعید از قیاس ہے کہ شکار کے زمانے کے انسان الگ تھلگ خاندانوں میں رہتے تھے کیونکہ اس طرح تو انسان کی جسمانی طور پر دفاعی کمتری ایسے خاندانوں کو خونخوار درندوں کا شکار بنا دیتی۔ عموماً وہ مخلوق جو انفرادی دفاع کی اہل نہیں ہوتی، فطری طور پر گروہوں میں رہتی ہے اور ملیے نوکیلے دانت، خونخوار پنجے اور سخت کھالوں والے درندوں کی دنیا میں بقاء کے ذرائع تلاش کرتی ہے۔ غالباً انسان کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ چنانچہ اس نے شکاری جتھوں اور جرگوں میں متحد ہو کر اپنا دفاع کیا۔ معاشرتی تنظیم کے طور پر جب معاشی تعلقات اور سیاسی غلبے نے رشتہ داری کی جگہ لے لی تو جرگے نے معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ ہونے کا مقام کھو دیا۔ کیونکہ زیریں سطح پر خاندان اور بالائی سطح پر ریاست نے اس کی اہمیت کو کم کیا۔ حکومت نے نظم و نسق جبکہ خاندان نے صنعت کی تنظیم نو اور نسل کو جاری رکھنے کا کام سنبھال لیا۔

نچلے درجے کے جانوروں میں نسل کا تحفظ نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ بڑی تعداد میں انڈے دیئے جاتے ہیں جن میں سے کچھ بچ کر نمو پا جاتے ہیں جبکہ زیادہ تعداد ضائع ہو جاتی ہے یا انہیں کھا لیا جاتا ہے۔ بہت ساری مچھلیاں ہر سال لاکھوں انڈے دیتی ہیں۔ کچھ قسم کی مچھلیاں اپنی اولاد کے لئے کم تردّد کرتی ہیں اور اپنے مقاصد کے لئے ہر سال پچاس انڈے کافی سمجھتی ہیں۔ پرندے اپنے بچوں کی بہتر نگہداشت کرتے ہیں اور ہر سال پانچ سے بارہ انڈوں میں سے بچے نکال لیتے ہیں۔ دودھ دینے والے جانور فی مادہ ہر سال تین بچوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ جانوروں

کی پوری دنیا میں افزائش اور تباہی والدین کی دیکھ بھال میں اضافے کے ساتھ زیادہ یا کم ہوتی ہے، پوری انسانی دنیا میں شرح اموات و پیدائش تہذیب کی ترقی کے ساتھ گر جاتی ہیں۔ اچھی خاندانی دیکھ بھال سے طویل بچپنہ ممکن ہوتا ہے جس سے بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے پہلے بھرپور تربیت حاصل کرتے ہیں۔ تخفیف شدہ شرح پیدائش کی بدولت انسانی توانائی افزائشِ نو سے بچ کر دیگر سرگرمیوں پر صرف ہوتی ہے۔

جہاں تک ہم تاریخ کے دھندلکے میں دیکھ سکتے ہیں۔ ابتداء میں ماں نے زیادہ تر خاندانی وظائف سرانجام دیئے۔ چنانچہ پہلے خاندان اس مفروضے پر منتظم ہوا کہ اس میں مرد کی حیثیت سطحی اور ضمنی تھی جبکہ عورت کی حیثیت بنیادی اور ارفع تھی۔ بعض قبیلوں اور غالباً انسانی گروہوں میں جس طرح افزائشِ نسل میں نر جانور کے کردار پر توجہ نہیں دی جاتی تھی جو جنسی عمل میں سے گزرتے بچے پیدا کرتے اور علت و معلول سے قطعی بے خبر ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں میں مرد کے کردار کو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تروبیریان جزیرے کے رہنے والوں کے لئے حمل کوئی جنسی معاملہ نہیں تھا بلکہ ان کے خیال میں عورت کے اندر بھوت داخل ہو جاتا ہے۔ عموماً بھوت اُس وقت داخل ہوتا جب عورت نہا رہی ہوتی۔ لڑکی کہتی کہ ایک مچھلی نے مجھے کاٹ لیا ہے "کب"۔ میلنیوسکی پوچھتا، اس بچے کا باپ کون تھا، آگے سے ایک ہی جواب ملتا باپ نہیں تھا کیونکہ لڑکی غیر شادی شدہ تھی۔ میں زیادہ سیدھے لفظوں میں پوچھتا کہ جسمانی باپ کون تھا، لیکن میرے سوال کو پھر بھی نہ سمجھا جاتا اور آگے سے ایک ہی جواب ملتا " ایک بھوت نے اُسے یہ بچہ دیا ہے"۔ ان جزیرے والوں کا ایک عجیب و غریب عقیدہ تھا کہ اُس عورت میں بھوت جلدی داخل ہوتا ہے جس کے مردوں کے ساتھ زیادہ

تعلقات ہوں۔ حمل کے خلاف حفاظتی اقدامات کے طور پہ یہ لڑکیاں زیادہ بڑی لہر والے پانی میں نہانے سے اجتناب برتیں جبکہ مردوں کے ساتھ تعلقات سے گریز نہ کرتیں۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جو فیاضی کے پریشان کن نتیجے میں بڑی سہولت ثابت ہوئی ہو گی۔

میلینشیا میں حمل کا سبب جنسی عمل کو قرار دیا جاتا تھا لیکن غیر شادی شدہ لڑکیاں اپنی غذا میں کسی شے کی موجودگی کو اس کا سبب قرار دیتیں۔ یہاں تک کہ مرد کے عمل کو سمجھ لینے کے باوجود جنسی تعلقات کی بے قاعدگی کے سبب باپ کا تعین کرنا آسان معاملہ نہیں تھا۔ نتیجتاً غیر متمدّن زمانے کی ماں اپنے بچے کے والد کے بارے میں زیادہ متفکر نہ ہوتی کیونکہ اُس کی شناخت اُس کا خاوند نہیں تھا بلکہ وہ اپنے باپ، بھائی یا جرگے کی ملکیت ہوتی تھی، انہی کے ساتھ وہ رہتی اور اس کا بچہ انہی مرد رشتہ داروں کو جانتا تھا۔ بھائی اور بہن کے درمیان محبت کا تعلق خاوند اور بیوی کے تعلق سے زیادہ مضبوط تھا۔ بہت سارے قبیلوں میں خاوند اپنی ماں کے خاندان اور جرگے میں رہتا اور اپنی بیوی سے صرف خفیہ ملاقاتی کی طرح مل سکتا تھا۔ حتیٰ کہ کلاسیکی تہذیب میں بھائی خاوند سے زیادہ پیارا ہوتا تھا۔ انتافرنیس کی بیوی نے دادا کے غضب سے اپنے خاوند کی بجائے بھائی کو بچایا تھا۔ انیٹگنی نے اپنے بھائی کے لئے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ "یہ تصور کہ آدمی کی بیوی اس کے لئے دنیا کی سب سے پیاری شخصیت ہے۔ نسبتاً زیادہ جدید تصور ہے اور ایسا تصور ہے جو نسلِ انسانی کے چھوٹے حصے تک محدود ہے۔"

غیر متمدن معاشرے میں باپ بچوں کے درمیان تعلق اتنا کم ہوتا تھا کہ زیادہ تر قبیلوں میں میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے۔ آسٹریلیا اور نیو گیانا، افریقہ اور مائیکرونیشیا آسام اور برما میں الیوٹوں، اسکیموز اور سیموئیڈوں اور زمین پہ آج بھی اِدھر اُدھر

ایسے قبیلے مل سکتے ہیں جن میں بظاہر خاندانی زندگی نہیں ہے۔ مرد عورتوں سے الگ رہتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے پاس جاتے ہیں یہاں تک کہ کھانا بھی الگ الگ کھایا جاتا ہے۔ شمالی پاپوا میں معاشرتی طور پر مرد کا عورت سے ملنا جلنا مناسب خیال نہیں کیا جاتا خواہ عورت اُس کے بچوں کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ تاہیتی میں خاندانی زندگی سے واقفیت ہی نہیں ہے۔ دو جنسوں کی اس علیحدگی سے "مقدس ملاپ" کا تجسس عموماً مردوں میں زیادہ پیدا ہوا جو غیر متمدن نسلوں میں ہر کہیں نظر آتا ہے اور عورت کے خلاف اکثر پناہ کا کام دیتا ہے۔ یہ ایک اور نقطے ــــ اپنے تربیتی نظام میں ــــ پر ہماری جدید مجلسوں سے مشابہہ ہے۔

خاندان کی سادہ ترین شکل عورت اور اُس کے بچے تھے جو جرگے میں اپنی ماں یا بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس قسم کا نظام جانوروں کے خاندان کا فطری نتیجہ اور غیر متمدن انسان کی حیاتیاتی جہالت تھی۔ ایک اور متبادل ابتدائی شکل "مادری مقامی شادی" تھی۔ اس قسم کی شادی میں خاوند اپنا جرگہ چھوڑ کر اپنی بیوی کے جرگے اور خاندان میں رہنا شروع کر دیتا اور اُس کے ساتھ اُس کے والدین کی خدمت کے لئے محنت مزدوری کرتا۔ ان معاملات میں شجرہ نسب عورت کی طرف سے بنتا اور وراثت بھی ماں کے ذریعے منتقل ہوتی۔ یہ مادری حق "مادری حکومت" نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا مطلب مرد پر عورت کی حکومت نہیں تھا۔ حتیٰ کہ جب عورت کے ذریعے جائیداد منتقل کی جاتی۔ اُس وقت بھی اُس کے اختیارات کم تھے۔ اُسے رشتہ داری تلاش کرنے کے ذرائع کے طور پر استعمال کیا جاتا جو قدیم لوگوں کی غفلت یا آزادی کی وجہ سے بصورت دیگر بے نام و نشان ہوتی تھی۔

یہ سچ ہے کہ معاشرے کے کسی بھی نظام میں عورت گھر میں اس کی اہمیت، کھانا تقسیم کرنے اور مرد کی مزدوری ــــ جس سے وہ انکار کی قوت بھی رکھتی ہے۔

کے سبب خاص اختیار رکھتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بعض اوقات جنوبی افریقہ کے کچھ قبیلوں میں عورتیں حکمران رہی ہیں۔ پیسکو کے جزیرے میں قبیلے کا سردار اُس قبیلے کی بزرگ عورتوں کے مشورے کے بغیر کوئی بھی بڑا کام نہیں کرتا تھا۔ ایروقبیل میں قبائلی مشاورت میں بیویوں کے بولنے اور رائے دینے کے حق مساوی تھے۔

سنیکا انڈینز میں عورتوں کے پاس بہت اختیارات ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ قبیلے کی سردار بھی ہو سکتی تھیں۔ لیکن ایسے معاملات بہت کم تھے۔ مجموعی طور پر ابتدائی معاشروں میں عورت کی حیثیت، غلامی کے قریب قریب تھی۔ اس کی نوبتی مجبوری، ہتھیاروں سے عدم واقفیت، بچے کی تولید، پیدائش اور پرورش میں اس کی حیاتیاتی قوت کا استعمال وغیرہ نے جنس کی اس لڑائی میں اُسے لاچار کر دیا اور سب سے ادنیٰ اور اعلیٰ معاشروں میں اُس کی حیثیت کمتر رہی۔ نہ ہی تمدن کی ترقی کے ساتھ اُس کی حیثیت میں کوئی اضافہ ہوا بلکہ پیریکلیز کے زمانے میں ان کی حیثیت شمالی امریکی انڈینز کی عورتوں کے مقابلے میں گھٹ گئی۔ یہ مقام اُس کی علمی اہمیت کے مطابق گھٹتا بڑھتا رہا جبکہ انسانوں کی تہذیب اور اخلاق میں ترقی و تنزل سے اس میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا۔

شکار کے عہد میں وہ شکار کے سوا ہر قسم کا کام کرتی تھی۔ جبکہ مرد شکار کے خطرات اور سختیوں سے نمٹنے کے لئے سارا سال آرام کرتا تھا۔ عورت کثرت سے بچے پیدا کرتی، ان کی پرورش، گھر کی دیکھ بھال کرتی، جنگلوں اور کھیتوں سے غذا اکٹھی کرتی، کھانا پکاتی، صفائی کرتی، کپڑے سیتی اور جوتے وغیرہ بناتی۔ چنانچہ جب قبیلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتا تو مرد سامانِ شکار کے علاوہ کچھ نہ اُٹھاتا کہ اسے بیرونی حملے کا سامنا کرنا ہوتا تھا جبکہ عورت باقی تمام گھر کا سامان اُٹھاتی تھی۔ جنگلی عورتیں نوکروں اور بار برداری کے جانوروں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں اگر

وہ کمزوری کے باعث سفر نہ کر سکتیں تو انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا جاتا۔ جب زیریں مرتے کے مقامی باشندوں نے سامان سے لدے ہوئے بیل دیکھے تو انہوں نے سمجھا کہ یہ سفید فاموں کی بیویاں ہیں۔ طاقت میں فرق ——— جس کی بنا پر دو جنسوں میں امتیاز قائم کیا جاتا ہے، اُس زمانے میں نہیں تھا۔ یہ فرق خلقی نہیں بلکہ ماحولیاتی ہے۔ اپنی حیاتیاتی مجبوریوں کے باوجود عورت قد، برداشت، طاقت اور ہمت میں مرد کے برابر تھی کیونکہ ابھی تک وہ زیور، آرائش کی شے یا جنسی کھلونا نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ وہ ایک مضبوط جانور تھی جو لمبے وقت کے لئے کڑا کام کر سکتی تھی اور ضرورت پڑنے پر اپنے بچوں، قبیلے یا جرگے کے لئے اپنی زندگی قربان کر سکتی تھی۔ شیپواز کے ایک سردار کا کہنا تھا کہ "عورت کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ایک عورت اتنا وزن کھینچ یا اُٹھا سکتی ہے جتنا دو مرد اٹھاتے تھے۔ وہ خیمے بناتی، کپڑے تیار کرتی، ان کی مرمت کرتی اور رات کے وقت ہمیں گرم رکھتی ہے، ہم ان کے بغیر سفر نہیں کر سکتے۔ وہ بہت کم قیمت پر زیادہ کام کرتی ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ پکانے کا کام کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا کڑے وقت میں صرف انگلیاں چاٹ کر گزارہ کر سکتی ہیں۔"

ابتدائی معاشرے میں معاشی ترقی زیادہ تر مرد کی بجائے عورت کی بدولت تھی۔ صدیوں تک مرد شکار اور غلہ بانی کے قدیم طریقوں سے چمٹا رہا جبکہ عورت نے اپنے پڑاؤ کے قرب و جوار میں زراعت اور ایسے فنون کو فروغ دیا جو بعد کے زمانے کی اہم ترین صنعتیں بن گئے۔ سُوت کا پودا جسے اہلِ یونان "اُون سے لدا" درخت کہتے قدیم عورتیں اُس سے دھاگا بناتیں اور سوت کا کپڑا تیار کرتیں۔ یہ عورت ہی تھی جس نے سینا پرونا، کپڑے بُننا، ٹوکری سازی، برتن سازی، لکڑی کا کام اور عمارت کی تعمیر شروع کی۔ بہت سارے معاملات میں عورت ہی نے ابتدائی

تجارت کو رواج دیا۔ اُس نے گھر کی تزئین کی اور اپنے پالتو جانوروں کی فہرست میں مرد کو بھی شامل کر لیا اور اُسے سماجی رجحانات اور خوش اطواری کی تربیت دی جو تہذیب کی نفسیاتی بنیاد ہیں۔

لیکن جیسے جیسے زراعت میں پیچیدگیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں اور اس سے زیادہ فائدہ ہونے لگا ویسے ویسے صنفِ توانا (مرد) نے اسے زیادہ سے زیادہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مویشی پالنے سے مرد کو دولت کا نیا ذریعہ طاقت اور قوت ملی۔ زراعت جو یقیناً قدیم طاقتور مردوں کو بے کیف لگتی تھی بالآخر مردوں نے اُسے تسلیم کر لیا، اس کے ساتھ ہی معاشی رہنمائی جو ایک مدت تک عورتوں کے پاس تھی وہ اب مردوں کے دائرہ اختیار میں آ گئی۔ عورتوں کے سدھائے ہوئے جانور جب میدان میں کام کرنے لگے تو عورتوں کا نعم البدل ثابت ہوئے جو اب تک خود کھیت میں کام کرتی تھیں۔ چنانچہ کھیتوں کا کام بھی مرد کے قبضے میں آ گیا۔ کدال سے ہل کی طرف ترقی سے جسمانی قوت میں بڑھوتری آ گئی اور مرد اس قابل ہو گیا کہ اپنی فوقیت کا دعویٰ کر سکے۔

مویشیوں اور زمینی پیداوار کے ملکیتی انتقال کی افزائش کے باعث عورت کی جنسی ماتحتی کا دوسرا دور شروع ہوا کیونکہ مرد اب عورت سے اُس وفاداری کا متقاضی تھا جس کے ذریعے وہ جائیداد اپنے بچوں کو منتقل کر سکے۔ بتدریج مرد نے اپنا اختیار منوا لیا، باپ کے اختیار کو تسلیم کر لیا گیا اور جائیداد مرد کے ذریعے منتقل ہونے لگی۔ ماں کے حق نے باپ کے حق کے سامنے سپر ڈال دی اور پدرسری خاندان جس میں سب سے بزرگ مرد سردار ہوتا، معاشرے کا معاشی قانونی، سیاسی اور اخلاقی یونٹ بن گیا۔ پہلے نسوانی دیوتا ہوتے تھے جو اب مردانہ بن گئے تھے اور ان کے ایسے ایسے حرم تھے جن کا لوگ تنہائی میں خواب دیکھا کرتے تھے۔

مادری نظام سے پدر سری نظام کی طرف منتقلی عورت کی حیثیت کے لئے نقصان دہ تھی۔ تمام اہم پہلوؤں کے اعتبار سے وہ اور اُس کے بچے پہلے تو اس کے باپ اور سب سے بڑے بھائی اور بعد میں اُس کے خاوند کی ملکیت بن گئے۔ اُسے شادی کے لئے اس طرح خریدا جانے لگا جس طرح کسی غلام کو منڈی سے خریدا جاتا تھا۔ جب اس کا خاوند مرتا تو وہ جائیداد کے طور پر اُس کے وارثوں کے پاس آتی۔ انیوگیانا، نیو ہیبرڈ سلیمانی جزیرے، فجی، انڈیا وغیرہ میں تو اُسے اپنے خاوند کی موت کے ساتھ مرنا پڑتا تھا یا توقع کی جاتی تھی کہ وہ اگلے جہاں میں اپنے خاوند کی خدمت کرنے کے لئے خودکشی کرے گی۔ اب باپ کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے خواہ انہیں کسی کو ایسے ہی دے دے یا بیچ دے۔ اس پر صرف ایسے ہی دوسرے والدوں کی معاشرتی لعن طعن ہوتی تھی۔ پدر سری نظام میں مرد کو اختیار تھا کہ وہ گھر سے باہر بھی جنسی روابط بڑھا سکے جبکہ عورت شادی سے پہلے مکمل طور پر اپنی عصمت قائم رکھنے اور شادی کے بعد اپنے خاوند کی وفادار رہنے کی پابند تھی۔ یوں دوہرا معیارِ زندگی پیدا ہو گیا۔

عورت کی محکومی جو شکار کے عہد میں موجود تھی اور جس میں مادری حق کے عہد میں کچھ تخفیف ہو گئی تھی۔ اب زیادہ عام اور بے رحمانہ ہو گئی تھی۔ قدیم روس میں باپ اپنی بیٹی کی شادی پر اُسے ہلکے سے ایک کوڑا لگاتا اور پھر وہی کوڑا دولہا کو پیش کر دیتا جو اس بات کی علامت تھا کہ اُسے مارنے کا حق اب دولہا کو حاصل ہو گیا ہے۔ حتٰی کہ امریکی انڈینز جن میں مادری حق کا زمانہ طویل عرصے تک رہا، اپنی عورتوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے۔ اُن سے خاطر مدارت کرواتے اور اکثر انہیں 'کتے' کے نام سے پکارتے۔ ہر طرف عورت کی زندگی مرد کے مقابلے میں گھٹیا سمجھی جاتی۔ جب لڑکیاں پیدا ہوتیں تو ایسی خوشی نہ منائی جاتی جو لڑکوں کی پیدائش

کے وقت منائی جاتی تھی۔ بعض اوقات مائیں اپنی بچیوں کو پریشانیوں اور مصیبتوں سے بچانے کے لئے خود ہی مار دیتی تھیں۔ فجی میں خوشی سے بیوی کو بیچ دیا جاتا جس کی عمومی قیمت ایک بندوق ہوتی تھی۔ کچھ قبیلوں میں مرد اور عورت اکٹھے نہیں سوتے تھے مبادا عورت کی سانس مرد کو کمزور کر دے۔ فجی میں مرد کے لئے باقاعدگی سے گھر میں سونا مناسب خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ نیوکیلیڈونیا میں عورت ایک چھپر کے نیچے سوتی جبکہ مرد گھر کے اندر سوتا تھا۔ فجی میں بعض مندروں میں کتوں کو تو داخلے کی اجازت تھی لیکن عورتوں کو تمام مندروں سے خارج کر دیا گیا تھا۔ مذہبی رسومات سے عورتوں کا ایسا تخارج آج بھی اسلام میں موجود ہے۔ بے شک عورت نے ہمیشہ اُس مہارت سے لطف اُٹھایا جو دیر تک کی جانے والی گفتگو سے حاصل ہوتا ہے مرد کو دھتکار دیا جاتا یا بسا اوقات پیٹا جاتا۔ لیکن مجموعی طور پر مرد آقا تھا اور عورت شادیہ سافر عورتوں کو غلاموں کی طرح خریدتے جو کہ زندگی بھر کمائی کا ذریعہ ہوتیں۔ جب کافی تعداد میں بیویاں جمع ہو جائیں تو وہ باقی زندگی آرام کرتا جبکہ اُس کی بیویاں اُس کا سارا کام کرتیں۔ قدیم ہندوستان کے بعض قبائل عورت کو پالتو جانوروں کی طرح موروثی جائیداد کا حصہ سمجھتے تھے۔ تاہم موسیٰ کے آخری حکم میں اس معاملے میں کوئی واضح امتیاز ہے۔ نیگرو افریقہ میں عورت اور غلام میں کوئی فرق نہیں تھا، ماسوا یہ کہ وہ معاشی کام کے علاوہ جنسی تسکین کا باعث بھی تھیں۔ شادی ملکیت کے قانون اور غلامی کے حصے کے طور پر شروع ہوئی۔

چوتھا باب

تہذیب کے اخلاقی عوامل

کوئی بھی معاشرہ نظم و نسق کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور نظم و نسق قوانین و ضوابط کے بغیر ناممکن ہے۔ ہم اسے تاریخ کا قانون سمجھ سکتے ہیں کہ قوانین کی بہتات کی طرح رواج و دستور کی قوت معکوس طور پر متغیر ہوتی ہے۔ سوچ و فکر کی کثرت کی مانند جبلت کی قوت بھی اسی طرح معکوس طور پر متغیر ہو سکتی ہے۔ زندگی کے کھیل کے لئے کچھ ضابطے لازمی ہیں۔ یہ ضابطے مختلف گروہوں میں مختلف ہو سکتے ہیں لیکن گروہ کے اندر انہیں ایک جیسا ہونا چاہیئے۔ یہ ضابطے رسومات، رواج، اخلاقی ضابطے اور قوانین ہو سکتے ہیں۔

رسومات

انسانی برتاؤ کی وہ شکلیں ہیں جنہیں لوگوں نے مناسب خیال کیا۔

رواج

وہ رسومات ہیں جنہیں آنے والی نسلوں نے آزمائشوں، غلطیوں اور قطع و برید کے بعد قدرتی طور پر منتخب کر کے قبول کیا۔

اخلاقی ضابطے

ایسے رواج ہیں جنہیں گروہ اپنی بہبود اور ترقی کے لئے لازمی خیال کرتا ہے۔ غیر متمدن معاشروں میں جب تحریری قانون نہیں ہوتا تھا یہ اہم رواج اور

اخلاقی قوانین انسانی زندگی کے ہر شعبے کی ضابطہ بندی کرتے اور معاشرتی نظام کو استحکام و تسلسل دیتے تھے۔ وقت کے تدریجی سحر سے ایسی رسومات مسلسل تکرار کی بدولت فرد کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اگر وہ انہیں توڑتا ہے تو وہ ایک خاص قسم کا خوف، بے چینی اور شرم محسوس کرتا ہے۔ یہ اُس ضمیر یا اخلاقی سوچ کی ابتدا ہے جسے ڈارون جانوروں اور انسانوں میں مؤثر امتیاز گردانتا ہے۔ اپنی اعلیٰ شکل میں ضمیر معاشرتی شعور ہے۔ فرد کا گروہ سے متعلق ہونے کا احساس ہے جس کے باعث وہ وفاداری اور التفات جیسے اقدامات کرتا ہے۔ اخلاقیات جُز اور کل اور چھوٹے گروہ کا کسی بڑے گروہ کے درمیان تعاون ہے بے شک اس تعاون کے بغیر تہذیب ناممکن ہے۔

I شادی

ایسی رسوم جو کسی گروہ کے اخلاقی ضابطے کو متشکل کرتی ہیں کا پہلا کام جنسِ مخالف کے درمیان تعلقات کو باضابطہ بنانا ہے کیونکہ یہ تعلقات ابتری، تشدد، اور ممکن تنزل کا دائمی ذریعہ ہیں۔ اس جنسی ضابطہ بندی کی بنیادی شکل شادی ہے۔ جس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک جوڑے کے باہمی ربط کا نام ہے۔ یہ ایک متغیر اور غیر مستقل ادارہ ہے جو اپنی تاریخ کے دوران تقریباً ہر قابلِ تصور شکل اور تجربے ـــــ غیر متمدن دور میں جوڑے کی بغیر مل کر رہے بچوں کی دیکھ بھال سے لے کر جدید عہد میں بچوں کی دیکھ بھال کے بغیر مل کر رہنے تک ـــــ سے گزرا ہے۔

ہمارے حیوان نما آباؤ اجداد نے اسے ایجاد کیا۔ بعض پرندے بچے پیدا کرنے والے ساتھیوں کے طور پر ہمیشہ کے لئے یک زوجگی میں رہتے ہیں۔ بن مانسوں

میں پیدائش کے موسم تک والدین مل کر رہتے ہیں۔ اس میں کئی انسانی خدوخال ہیں، مادہ کے کسی قسم کے غیر محتاط برتاؤ پر نر سختی کا سلوک کرتا ہے۔ڈی گرسگنی کہتا ہے کہ "بورنیو کے بن مانس خاندانوں میں رہتے ہیں، نر، مادہ اور ایک بچہ" ڈاکٹر سیوج بن مانسوں کے متعلق لکھتا ہے کہ "بوڑھے بن مانسوں کو درخت کے نیچے بیٹھے پھلوں کی ضیافت اُڑاتے اور گپیں ہانکتے دیکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ ان کے بچے ان کے اردگرد خوشی سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اُچھل کود رہے ہوتے ہیں۔" شادی کا عمل انسان سے زیادہ پرانا ہے۔

شادی کے بغیر معاشرے بہت کم ہیں لیکن مستعد محقق ایسے کافی معاشروں کا کھوج لگا کر ادنٰے دودھ دینے والے جانوروں سے لے کر غیر متمدن انسانوں کی شادیوں تک آزاد مباشرت کے عبوری دور کو متعین کرسکتا ہے۔ فتونا اور ہوائی میں لوگوں کی اکثریت شادی نہیں کرتی تھی۔ اہلِ لیوبو آزادی سے اور بلا امتیاز مباشرت کرتے اور ان میں شادی کا تصور نہیں تھا۔ بعض بورنیو کے قبائل بغیر شادی کے مل کر پرندوں سے زیادہ آزاد رہتے تھے اور قدیم روس کے بعض لوگوں میں "مرد عورت کو بغیر امتیاز کے استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ کسی عورت کا کوئی مخصوص خاوند نہیں ہوتا تھا" افریقہ کے بونوں میں شادی کا دستور نہیں تھا لیکن "حیوانی جبلت کو بغیر کسی بندش کے پورا کرتے"۔ "عورت کے قومیائے جانے" کا یہ غیر متمدن عمل جو غیر متمدن عہد کی زمین اور غذا کی اشتراکیت کے پہلو بہ پہلو چلتا رہا اتنی جلدی مر گیا کہ اب اس کی کچھ نشانیاں بھی باقی نہیں۔ تاہم اس کی کچھ یادیں ہنوز باقی ہیں۔ فطری انسانوں کا احساس تھا کہ یک زوجگی جسے وہ مرد کی عورت پر اجارہ داری سمجھتے تھے ـــــ غیر فطری اور غیر اخلاقی ہے۔ "اختیار و آزادی کے موسمی میلوں میں" (آج بھی میڈری گراس میں کسی حد تک

موجود ہے) عارضی طور پر جنسی پابندیاں ہٹالی جاتی تھیں۔ اس میں کوئی بھی عورت مرد کی درخواست پر شادی سے پہلے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر سکتی تھی جیسا کہ بابل میں ملیتا کے مندر میں ہوتا تھا۔ بیوی اُدھار دینے کی رسم بہت سے غیر متمدن مہمان نوازی کے ضابطوں میں لازمی تھی۔ ابتدائی جاگیرداری یورپ میں شب زفاف کے حق کے ذریعے جاگیردار قبیلے کے بڑا نے حقوق کی نمائندگی کرتے ہوئے دلہن کے ساتھ پہلی رات بسر کرتا۔ اُس کے بعد دولہا کو شادی کا عمل پورا کرنے کی اجازت دی جاتی۔

تجرباتی اختلاط کی مختلف قسموں نے بتدریج بلا امتیاز تعلقات کی جگہ لے لی۔ ملاکا کے اورنگ سکائے میں ایک لڑکی قبیلے کے ہر مرد کے ساتھ کچھ وقت کے لئے رہتی، ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی۔ جب ایک چکر مکمل ہو جاتا تو پھر نئے سرے سے دوسرا چکر شروع ہو جاتا۔ سائبیریا کے یاکوتوں، جنوبی افریقہ کے بوتو قدول تبت کے نچلے طبقوں اور دوسرے کئی قبیلوں میں شادی قطعاً تجرباتی تھی اور کسی بھی فریق کے ارادے پر بغیر وجوہات پیش کئے ختم کی جا سکتی تھی۔ جنگلیوں میں تعلق کو ختم کرنے کے لئے معمولی اختلاف کافی تھا اور دونوں فریق فوراً نئی جگہ اپنے تعلقات استوار کر لیتے تھے۔ سر فرانسس گالٹن کے بقول "اہل دمارا میں ہر ہفتے جوڑا بدلا جاتا تھا اور بعض اوقات مجھے بغیر تحقیق کئے پتہ نہیں چلتا تھا کہ کسی خاص وقت میں فلاں عورت کا کون سا خاوند تھا" بیلا قبیلے میں "عورتوں کا لین دین ہوتا تھا اور وہ اپنی مرضی سے ایک خاوند کو چھوڑ کر دوسرے کے پاس جا سکتی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں ابھی اپنی عمر کا دوسرا عشرہ بھی پورا نہیں کرتی تھیں کہ ان کے چار یا پانچ زندہ خاوند ہوتے تھے" ہوائی میں شادی کے لئے جو لفظ استعمال ہوتا ہے اُس کا مطلب ہے "کوشش کرنا" تہتی میں ایک صدی قبل بچوں کی پیدائش تک مل کر رہنا

آزاد تھا۔ اگر بچہ پیدا ہو جاتا تو والدین بغیر معاشرتی لعن طعن کے اُسے مار سکتے تھے یا جوڑا بچے کی پرورش کے لئے زیادہ پائیدار تعلق بنا سکتا تھا۔ مرد نے مامتا کے فرض کو پورا کرنے کے بدلے میں عورت کی مدد کی حامی بھری ہے۔

مارکوپولو وسطی ایشیائی قبیلے کے متعلق جو تیرہویں صدی میں (جواب کیریا ہے) میں رہتا تھا، لکھتا ہے" اگر کوئی شادی شدہ مرد بیس دن کے لئے اپنے گھر سے کہیں دور جاتا ہے تو اُس کی بیوی کو حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے لئے کوئی اور خاوند منتخب کر لے۔ اسی طرح خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ جہاں قیام کرے وہاں اپنے لئے بیوی منتخب کر لے"۔ شادی اور اخلاقیات میں جدید تصورات کتنے قدیم ہیں۔

لی ٹورنیو نے شادی کے متعلق کہا ہے کہ" وحشی معاشرے کے دوران ہر ممکن تجربہ آزمایا گیا ہے۔ کئی نسلوں میں اب بھی اس پر عمل ہوتا ہے اور یورپ میں موجود عمومی اخلاقی تصورات کو اس سلسلے میں ذرا اہمیت نہیں دی جاتی"۔ مستقل تجربات کے علاوہ اجتماعی تجربات بھی تھے۔ کچھ معاملات میں" گروہی شادیاں" ملتی ہیں جس کے مطابق ایک گروہ سے تعلق رکھنے والے کئی مرد ایک اور گروہ سے تعلق رکھنے والی کئی عورتوں سے مجموعی طور پر شادی کر لیتے تھے مثلاً تبت میں رواج تھا کہ بھائیوں کا ایک گروہ بہنوں کے ایک گروہ سے شادی کر لیتا اور یہ دونوں گروہ جنسی اشتراکیت پر عمل کرتے، ہر مرد ہر عورت کے ساتھ رہتا تھا۔ قیصر نے قدیم برطانیہ میں ایک ایسے ہی رواج کا ذکر کیا ہے اس کی نشانیاں ابتدائی یہودیوں اور دوسری قوموں میں ملتی ہیں۔ جن کے مطابق ایک بھائی کا فرض تھا کہ دوسرے بھائی کی بیوہ سے شادی کرے۔ اس قانون سے اونان بہت تنگ آیا تھا۔

انسان کو غیر متمدن معاشرے کی نیم آزاد جنسی مباشرت کو انفرادی شادی میں تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ چونکہ فطری انسانوں کی اکثریت میں شادی سے پہلے کے جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد نہیں تھیں لہذا شادی کا دستور جسمانی خواہش کی بدولت ظہور میں نہیں آیا۔ کیونکہ شادی اپنی پابندیوں اور نفسیاتی جھنجلاہٹوں کے باوصف جنسی اشتراکیت کی طرح مردوں کی نفسانی خواہشات کی تسکین نہیں کر سکتی تھی۔ نا ہی شروع میں مرد انفرادی طور پر امور خانہ داری میں اتنے مضبوط تھے کہ اپنے بچوں کی پرورش اُس کی ماں، خاندان اور جرگے کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر کر سکیں۔ بعض مخصوص معاشی مقاصد ایسے ہوں گے جنہوں نے شادی کے ارتقاء میں مدد کی ہوگی۔ (ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم آغاز کے متعلق کتنا کم جانتے ہیں) غالباً یہ مقاصد ملکیت کے بڑھتے ہوئے ادارے سے جڑے ہوئے تھے۔

انفرادی شادی مرد کی سستے غلاموں اور اپنی جائیداد کو دوسرے مردوں کے بچوں کے پاس جانے سے بچانے کی خواہش کے نتیجے میں عمل پذیر ہوئی۔ تعدد ازدواج بعض اوقات چند شوہری (ایک عورت کے کئی مرد) کی صورت میں سامنے آئی مثلاً اہلِ ٹوڈا اور تبت کے بعض قبائل میں یہ رواج پایا جاتا ہے یہ دستور آج بھی اُن علاقوں میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں عورتوں کی نسبت مرد کثرت سے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دستور جلد ہی فاتح مرد کا شکار بن گیا اور کثیر الزواجی ــــ ایک مرد کئی بیویاں ــــ عمل میں آئی۔ قرونِ وسطیٰ کے الہیات پسندوں کا خیال ہے کہ محمد نے کثیر الزواجی کو شروع کیا لیکن یہ اسلام سے کچھ سال پہلے کا دستور تھا جو قدیم دنیا میں شادی کا مروّجہ طریقہ تھا۔ اسے عمومی بنانے میں بہت ساری وجوہات شامل ہیں۔ قدیم معاشرے میں شکار اور جنگ کی وجہ سے مرد کی زندگی

زیادہ پُر تشدد اور پُر خطر تھی۔ مردوں کی شرح اموات عورتوں کی نسبت زیادہ تھی اس کے نتیجے میں عورتوں کی کثرت اور عورتوں کی اقلیت کے بجز تجرد (کنوارپن) میں انتخاب تعدد ازدواج پر مجبور کرتی تھی۔ لیکن ایسا تجرد اُن قبیلوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا جو بلند شرح اموات کی تلافی بلند شرح پیدائش سے کرنا چاہتے تھے ایسے قبیلے بنا ساتھی اور لاولد عورت سے نفرت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مرد تنوع پسند تھے۔ انگولا کے نیگرو کہتے تھے کہ وہ "ہمیشہ ایک ہی تھالی میں کھانا پسند نہیں کرتے"۔ مزید برآں مرد جوان عورتوں کو پسند کرتے جبکہ غیر متمدن معاشروں میں عورتیں جلدی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اکثر عورتیں تعددِ ازدواج کو پسند کرتیں کیونکہ اس کے باعث وہ بچوں کی طویل پرورش اور کثرت سے بچے پیدا کرنے کی زحمت سے بچ جاتیں جبکہ مرد کی نفسانی اور زیادہ بچے پیدا کرنے کی خواہش میں بھی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ بعض اوقات جب پہلی بیوی محنت کر کے تھکن سے چُور ہو جاتی تو اپنے خاوند کے لئے ایک اور بیوی حاصل کرنے میں اُس کی مدد کرتی تاکہ اُس کا بوجھ بٹ جائے اور اضافی بچے خاندان کی پیداواری قوت اور دولت میں اضافہ کر سکیں۔ بچے معاشی اثاثہ تھے اور مرد عورتوں پر سرمایہ کاری کر کے سود کے طور پر اُن سے بچے حاصل کرتے تھے۔ پدرسری نظام میں بیویاں اور بچے مرد کے غلام ہوتے تھے۔ یہ تعداد میں جتنے زیادہ ہوتے وہ اتنا ہی امیر ہوتا تھا۔ غریب آدمی ایک بیوی رکھتا لیکن وہ اسے شرمناک صورتحال سمجھتا جس سے ایک دن وہ کثیر الازواج مرد کے باعزت مقام تک پہنچے گا۔

بے شک کثیر الازواجی اس معاشرے کی ازدواجی ضروریات کے عین مطابق تھی جہاں عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ تھیں۔ اس کی اہمیت اصلاحِ نسل کی بھی تھی جو معاصر یک ازواجی سے بہتر تھی۔ جدید معاشرے میں قابل اور ذہین

آدمی زیادہ عمر میں شادی کرتا ہے اور اس کے کم بچے ہوتے ہیں۔ کثیر الازدواجی کے تحت قابل ترین آدمی کی بہترین بیویاں اور زیادہ سے زیادہ بچے ہوتے تھے۔ چنانچہ کثیر الازدواجی تمام فطری قوموں حتیٰ کہ مہذب انسانوں کی اکثریت میں بھی باقی رہی۔ مشرق میں یہ حال ہی میں ختم ہونا شروع ہوئی ہے۔ تاہم بعض حالات نے اس کے خلاف عمل کیا۔ زرعی زندگی کی بدولت خطرے اور تشدد میں کمی سے جنسِ مخالف تعداد کے اعتبار سے مساوی ہوگئی۔ ان حالات کے تحت کھلی کثیر الازدواجی خوشحال اقلیت کا خاص امتیاز بن گئی۔ لوگوں نے اکثریت سے زیادہ تر ایک زوجی پر عمل کیا جس میں زناکاری شامل تھی جبکہ دوسری اقلیت یعنی کنواروں نے امراء کی کثیر الازدواجی میں توازن پیدا کر دیا۔ مرد میں حسد اور عورت میں ملکیت کا تصور مؤثر طور پر اس صورت حال میں داخل ہوا جب جنسِ مخالف تعداد میں برابر ہو گئے کیونکہ یہاں طاقتور مرد زیادہ تعداد میں بیویاں نہیں رکھ سکتا تھا بجز اس کے کہ وہ دوسرے مردوں کی حقیقی اور امکانی بیویوں کو حاصل کر کے اپنی بیویوں کو اشتعال دلائے۔ اس طرح کثیر الازدواجی ایک مشکل معاملہ بن گئی اور چالاک ترین مرد ہی اسے قائم رکھ سکے۔ جوں جوں جائیداد بڑھتی گئی اور مرد آنے والی نسلوں کے لئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں جائیداد تقسیم کرنے سے نفرت کرنے لگا تو اُسے خیال آیا کہ "بڑی بیگم" اور لونڈیوں میں امتیاز قائم کرے تاکہ صرف اوّل الذکر کے بچے ہی وراثت میں حصّہ دار ہوں۔ ہماری نسل تک ایشیا میں شادی کی صرف یہی حیثیت باقی رہ گئی۔ بتدریج بڑی بیگم ہی واحد بیوی رہ گئی۔ لونڈیوں کو علیحدہ اور خفیہ رکھا گیا یا وہ غائب ہو گئیں۔ یورپ میں جوں جوں عیسائیت منظرِ عام پر آئی جنسی تعلق کی قانونی شکل کے طور پر یک زواجی نے کثیر زواجی کی جگہ لے لی۔ لیکن تحریر اور ریاست کی طرح یک زواجی بھی مصنوعی ہے اور تاریخ

کا حصہ ہے تاکہ تہذیب کے آغاز کار۔

جنسی تعلق کی خواہ کوئی صورت ہو شادی تقریباً تمام غیر متمدن قوموں میں فرض تھی۔ غیر شادی شدہ مرد کی کمیونٹی میں کوئی عزت نہ ہوتی اور اُسے آدھا مرد تصور کیا جاتا۔ جرگے سے باہر شادی بھی لازمی تھی یعنی مرد سے توقع کی جاتی کہ وہ اپنے جرگے کی بجائے کسی اور جرگے سے بیوی حاصل کرے۔ کیا یہ دستور اس لئے پیدا ہوا کہ غیر متمدن ذہن بچوں پر قریبی شادی سے پیدا ہونے والے بُرے اثرات کے متعلق تشکک کرتا تھا یا اس طرح کئی گروہوں کے درمیان شادیاں سیاسی اتحاد کو مضبوط بناتیں، معاشرتی تنظیم کو فروغ دیتیں اور جنگ کے خطرے کو کم کرتی تھیں۔ یا دوسرے قبیلے سے بیوی حاصل کرنا مردانگی کی علامت بن گیا تھا یا یہ کہ قُرب سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور فاصلہ خیال کو زیادہ دلربائی بخشتا ہے۔ ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تاہم غیر متمدن معاشرے میں پابندی ہمہ گیر تھی۔ اگرچہ فرعونوں، بطلیموسیوں اور اہلِ انکا نے اس کی زبردست خلاف ورزی کی۔ یہ تمام بھائی بہن کی شادی کے حامی تھے۔ یہ رومیوں اور جدید قانون میں باقی رہ گئی اور شعوری اور لاشعوری طور پر آج بھی ہمارے رویوں کو ترتیب دیتی ہے۔

مرد دوسرے قبیلے سے کیسے بیوی حاصل کرتا تھا؟ جہاں مادری تنظیم مضبوط تھی اُسے اکثر اپنی مطلوبہ لڑکی کے جرگے میں جاکر رہنا پڑتا تھا۔ جوں جوں پدری نظام ترقی کرتا گیا طالب (مرد) کو اجازت مل گئی کہ لڑکی کے باپ کی کچھ عرصہ خدمت کرنے کے بعد اپنی بیوی کو اپنے قبیلے میں لے جاسکے۔ یعقوب نے لیح اور راشیل کے لئے لابان کی خدمت کی۔ بعض اوقات عاشق طاقت کے زور پر معاملے کو مختصر بنا دیتا۔ بیوی کو بھگا لے جانے میں فائدہ بھی تھا اور شان بھی کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک سستا غلام تھی بلکہ اُس سے نئے غلام پیدا ہوتے جو اس کی غلامی کو پابہ زنجیر کر

دیتے۔ بھگا کر لے جانے والی شادی اگرچہ قانون میں شامل نہیں تھی لیکن غیر متمدن دور میں اکثر واقع ہوتی تھی۔ شمالی امریکی انڈینز میں عورتوں کو جنگ میں مالِ غنیمت سمجھا جاتا جس کے باعث اکثر ایسا ہوتا کہ بعض قبیلوں میں خاوند اور بیویاں آپس میں اجنبی زبان بولتے تھے۔ روس اور سربیا کے سلیوز گزشتہ صدی تک لوٹ کھسوٹ کے ذریعے عارضی شادیاں کرتے تھے۔ اس کی نشانیاں شادی بیاہ کی رسوم میں دولہا کا دلہن کو پکڑنے میں ملتی ہیں۔ یہ قبائل کے درمیان لامتناہی جنگ کا منطقی پہلو تھا اور جنسِ مخالف کے درمیان دائمی جنگ کا نقطۂ آغاز تھا جس کا واحد نتیجہ رات کا پچھلا پہر اور بے خواب نیند تھا۔

دولت میں اضافے کے ساتھ اجنبی جرگے میں جاکر والد کی خدمت کرنے یا لوٹ کھسوٹ کی شادی کی وجہ سے ہونے والی لڑائی کے تشدد کا خطرہ مول لینے کی نسبت بیوی حاصل کرنے کے لئے والد کو دولت کا تحفہ دینا زیادہ آسان ہوگیا۔ نتیجتاً خرید کی شادی اور والدین کی طے کردہ شادی ابتدائی معاشروں میں قانون بن گیا۔ کچھ عبوری شکلیں بھی نمودار ہوئیں۔ میلینیشین بیویاں چُرا لیتے لیکن بعد میں لڑکی کے والدین کو ادائیگی کر کے چوری کو قانونی بنا لیتے۔ نیوگیانا کے بعض مقامی باشندوں میں مرد لڑکی کو بھگا کر لے جاتا اور جب وہ دونوں چھپے ہوتے تو وہ اپنے دوستوں کو لڑکی کے والدین کے ساتھ قیمت خرید پر سودے بازی کرنے پر مقرر کرتا جس آسانی کے ساتھ ان معاملات میں اخلاقی غصے کو دولت کے ساتھ دبا دیا جاتا، ایک دلچسپ بات ہے۔ ایک ماؤری ماں اونچی آواز میں بین کرتے ہوئے اُس نوجوان کو کوس رہی تھی جو اُس کی بیٹی کو بھگا کر لے گیا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نوجوان نے اُسے کمبل دے کر چُپ کروایا۔ اُس نے کہا " مجھے اس کی ہی ضرورت تھی۔ میں صرف کمبل حاصل کرنے کے لئے شور و غوغا کر رہی تھی"۔ عموماً دلہن کی قیمت

کمل سے زیادہ ہوتی تھی۔ ہوٹنٹوٹوں میں عورت کی قیمت بیل یا گائے تھی۔ کروڈس میں تین گائے اور ایک بھیڑ، کافروں میں چھ سے تیس مویشی جن کا انحصار لڑکی کے خاندان کی حیثیت پر تھا اور ٹوگو کے لوگوں میں سولہ ڈالر نقد اور چھ ڈالر کا سامان عورت کی قیمت تھا۔

غیر متمدن افریقہ میں شروع سے خرید کی شادی کا رواج رہا اور آج بھی چین اور جاپان میں یہ ایک عام دستور ہے۔ اس نے قدیم ہندوستان، جوڈیا اور کولمبس کی دریافت سے قبل کے مرکزی امریکہ اور پیرو میں فروغ پایا۔ آج کے یورپ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ پدرسری اداروں کا فطری ارتقاء ہے۔ باپ بیٹی کا مالک ہوتا ہے اور اپنی مرضی سے اُسے جہاں چاہے اور جیسے چاہے تھما سکتا ہے۔ اورینیکو کے انڈینز اس کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ طالب کو چاہیئے کہ اپنے استعمال کی لڑکی کے لئے اُس کے باپ کو پرورش کا خرچ ادا کرے۔ بعض اوقات لڑکی کو طالبوں کے سامنے "نمائشِ عروس" میں پیش کیا جاتا۔ چنانچہ سمائیوں میں دلہن کو خوب بنا سنوار کر گھوڑے پر بٹھایا جاتا یا پیدل چلایا جاتا۔ فضاء کو خوب معطر کیا جاتا تاکہ چاہنے والوں کو زیادہ قیمت کے لئے راغب کیا جا سکے۔ خرید کی شادی کے متعلق عورت کے اعتراض کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس انہیں اپنے اوپر خرچ کی گئی رقم پر بہت غرور ہوتا تھا کہ محبت کے مقابلے میں بدمعاش مرد کچھ نہ دے کر بہت کچھ حاصل کر رہا ہوتا تھا۔ اس کے برعکس لڑکی کا والد عموماً دولہا کی ادا کردہ رقم کے بدلے اُسے تحفہ دیتا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلہن کے لئے پیش کی جانے والی رقم کے برابر ہو گیا۔ امیر باپ جو اپنی بیٹیوں کی راہ ہموار کرنے کی فکر میں تھے۔ بتدریج واپسی کے ان تحفوں کو بڑھاتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جہیز کا دستور چل نکلا۔ لڑکی کے باپ کا لڑکی کے لئے خاوند خریدنے کے عمل نے

بیوی خریدنے کے عمل کی جگہ لے لی۔

شادی کی ان تمام قسموں اور شکلوں میں رومانوی محبت کی نشانی نہیں ملتی۔ یلوگیانا کے پاتوان قبیلے میں محبت کی شادی کے چند واقعات ملتے ہیں۔ دیگر غیر متمدن قوموں میں محبت کے واقعات سامنے آتے ہیں (باہمی ضرورت کی بجائے باہمی محبت کی شکل میں) لیکن عموماً ان محبتوں کا شادی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ سادہ وقتوں میں مرد سستی محنت، منافع بخش والدیت اور باقاعدہ کھانے کے لئے شادی کرتا تھا۔ لینڈر کہتا ہے کہ "یریتیا میں مقامی باشندے قطعی لاتعلقی سے شادی کرتے تھے ہر مرد بیوی حاصل کرنے کے متعلق اتنا کم سوچتا ہے جتنا اناج کا دانا توڑنے کے متعلق سوچتا ہے۔ محبت قطعی طور پر موجود نہیں ہوتی ہے" غیر متمدن معاشرے میں شادی سے قبل جنسی تعلقات بکثرت ہوتے ہیں۔ جنسی عمل میں رکاوٹ نہ ہونے کے سبب جذبات اکٹھے نہیں ہوتے۔ چنانچہ بیوی کے انتخاب میں شاذونادر ہی اثر انداز ہوتے خواہش کی تکمیل میں تاخیر کی عدم موجودگی کی بناء پر باطنی مایوسی اور تصوراتی جذباتیت کا وقت نہیں ملتا جو عموماً نوجوان رومانوی محبت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ایسی محبت ترقی یافتہ تہذیبوں کا حصہ ہے جہاں اخلاقیات نے خواہش کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ دولت کی افزائش نے کچھ مردوں کو رومانس کے تعیش اور نزاکتوں کے قابل بنا دیا ہے اور عورتیں انہیں یہ تعیش اور لطافتیں فراہم کرتی ہیں۔ غیر متمدن لوگ اتنے مفلس ہوتے تھے کہ وہ رومینٹک نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے گیتوں میں عشقیہ شاعری نہیں ملتی۔ جب مشنریوں نے الگونقوئنز کی زبان میں بائیبل کا ترجمہ کیا تو انہیں مقامی زبان میں 'محبت' کا مترادف لفظ نہ ملا۔ ہوٹنٹاٹ شادی کے متعلق ایک دوسرے سے سردمہری اور لاتعلقی کا برتاؤ کرتے۔ گولڈ کوسٹ پر "خاوند اور بیوی میں محبت کی جھلک تک موجود نہ تھی"۔ قدیم آسٹریلیا میں بھی ایسا ہی

تھا۔ ایک سینیگال نیگرو کے متعلق گیلی کہتا ہے، "میں نے بابا سے پوچھا کہ وہ بعض اوقات اپنی بیوی کے ساتھ خوشیاں کیوں نہیں مناتا۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر وہ ایسا کرے تو وہ انہیں قابو میں نہیں رکھ سکے گا" ایک آسٹریلوی سے پوچھا گیا کہ وہ شادی کیوں کرنا چاہتا ہے تو اُس نے دیانت داری سے جواب دیا کہ اُسے ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو اُس کے لئے خوراک و پانی مہیا کرے اور سفر میں اس کا سامان اُٹھا سکے۔ بوسہ لینا جو امریکیوں کے لئے ناگزیر ہے غیر متمدن لوگ اس سے واقف نہیں تھے یا حقارت سے دیکھتے تھے۔

شاید جانوروں کے یہاں جنس کا کوئی فلسفہ ہو، لیکن "وحشی" جنس کے متعلق ہر قسم کے مابعد الطبیعاتی اور الہیاتی دھڑکوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اُس کے یہاں جنس کا کوئی فلسفہ نہیں کیونکہ وہ نہ تو اس کے متعلق سوچتا ہے اور نہ ہی اس بارے میں جذباتی ہوتا ہے۔ یہ اس کے لئے اُس کی خوراک کی طرح کا ایک معمول ہے۔ وہ شائستہ پسندانہ تصورات کا بہانہ نہیں کرتا۔ شادی اُس کے لئے کوئی مقدس شئے نہیں اور نہ ہی فضول خرچی کی رسم ہے۔ بلکہ یہ خالصتاً ایک تاجرانہ سودا ہے۔ اُسے ساتھی کے انتخاب میں جذباتی تصورات کو عملی تصورات کا ماتحت بناتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس معاملے میں شرم محسوس کرتا ہے۔ وہ ہم سے اس دستور کی توضیح طلب کرے گا کہ ایک ملے کی جنسی خواہش کی تسکین کے لئے ساری عمر کے لئے ایک مرد اور ایک عورت کو شادی کے بندھن میں کیوں باندھ دیا جائے۔ غیر متمدن مرد شادی کو جنسی اجازت نامے کی حیثیت سے نہیں بلکہ معاشی تعاون کے طور پر دیکھتا تھا۔ وہ عورت سے اچھائی اور حسن کی خواہش نہیں کرتا تھا (اگرچہ وہ اس میں ان خوبیوں کی تعریف کرتا تھا) بلکہ فائدے اور محنت کی توقع رکھتا تھا وہ اُس کے لئے گھاٹے کا سودا نہیں تھی بلکہ معاشی اثاثہ تھی۔ اگر وہ

اس کے لئے گھاٹے کا سودا ہوتی تو "وحشی" کبھی شادی کرنے کا نہ سوچتا۔ شادی ایک منافع بخش شراکت تھی تاکہ ذاتی نمائش بینی، جس کے ذریعے مرد اور عورت اکیلے اکیلے کام کرنے کی بجائے اکٹھے کام کرتے ہوئے زیادہ خوش حال ہوں۔ تہذیب کی تاریخ میں جہاں کہیں عورت شادی میں معاشی اثاثہ نہ رہی، شادی کے ادارے کو زوال آگیا اور بعض اوقات اس کے ساتھ تہذیب کو بھی زوال آگیا۔

II جنسی اخلاقیات

اخلاقیات کا ہمیشہ سب سے بڑا کام جنسی باقاعدگی ہے کیونکہ افزائش نو کی جبلت نہ صرف شادی کے اندر بلکہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی مسائل پیدا کرتی ہے یہ کسی بھی لمحے اپنی ضد، شدت، قانون سے نفرت اور بے راہ روی سے معاشرتی نظام کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ پہلا مسئلہ شادی سے پہلے کے جنسی تعلقات کا ہے۔ کیا ان پر پابندی عائد ہونی چاہیئے یا انہیں آزاد ہونا چاہیئے۔ ایام ماہواری کے علاوہ بھی نر کا مادہ کو جنسی عمل کے لئے قبول نہ کرتا جانوروں کی دنیا میں جنسی عمل کو سیدھے سادھے طریقے سے گھٹا دیتا ہے۔ ہماری شہوت پسند نوع میں ایسا نہیں ہوتا۔ بیو مارکس کہتا ہے انسان جانور سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ بغیر بھوک لگے کھاتا، بغیر پیاس کے پانی پیتا اور تمام موسموں میں جنسی عمل کرتا ہے۔ غیر متمدن لوگوں میں جانوروں کی پابندیوں کی مشابہت ملتی ہے یعنی عورت کے ساتھ ماہواری کے دنوں میں جنسی عمل پر پابندیاں۔ اس عمومی استثناء کے ساتھ شادی سے قبل جنسی عمل فطری معاشروں میں آزادانہ تھا۔ شمالی امریکی انڈینز میں نوجوان مرد اور عورتیں آزادی سے جنسی عمل کرتے اور ایسے تعلقات ان کی شادی کی راہ میں رکاوٹ نہ ہوتے۔ نیو گیانا کے پاپوؤں میں انتہائی ابتدائی عمر ہی سے جنسی

زندگی کا آغاز ہو جاتا اور شادی سے قبل آزاد مباشرت اُن کے یہاں دستور تھا۔ سائبریا کے ستوویوں، فلپائن کے اگوروٹوں، بالائی برما کے مقامی باشندوں، کافروں اور افریقہ کے جنگلیوں، نائجیریا، یوگنڈا، نیوگیانا، مرے جزائر، انڈامان جزائر، تہتی، پولینیشیا، آسام وغیرہ کے قبیلوں میں قبل از شادی جنسی تعلقات کی آزادی تھی۔

ایسے حالات میں ہمیں غیر متمدن معاشرے میں عصمت فروشی کی زیادہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ یہ "قدیم ترین پیشہ" مقابلتاً نیا ہے یہ تہذیب کے آغاز، جائیداد کے پیدا ہوتے اور قبل از شادی جنسی تعلقات کی آزادی کے ختم ہونے کے ساتھ وجود میں آیا۔ جہیز یا معبدوں کے لئے رقوم اکٹھی کرنے کے لئے لڑکیاں اِدھر اُدھر کچھ وقت کے لئے اپنے آپ کو بیچتی ملتی ہیں۔ لیکن ایسا وہاں ہوتا جہاں مقامی اخلاقی ضابطے فضول خرچ والدین کی مدد یا بھوکے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھنے کے لئے اس کی اجازت دیتے۔

پاک دامنی (عصمت) ایک جدید تصور ہے۔ غیر مہذب نوجوان لڑکی کو اپنی عصمت کے کھو جانے کا خوف نہیں بلکہ بانجھ پن کی شہرت کا ڈر ہوتا تھا۔ قبل از شادی حمل خاوند کی تلاش میں رکاوٹ بننے کی بجائے مددگار ثابت ہوتا کیونکہ اس سے بانجھ پن کے متعلق سارے شکوک رفع ہو جاتے اور نفع بخش بچوں کی پیدائش یقینی ہو جاتی تھی۔ ملکیت کے تصور سے پہلے زیادہ سادہ قبیلے کنوار پن سے نفرت کرتے تھے۔ کامچدل قبیلے کے دولہا کو جب یہ پتہ چلتا کہ اُس کی بیوی شادی سے پہلے جنسی عمل سے نہیں گزری تو وہ غصے میں آکر لڑکی کی ماں کو گالیاں بکتا کہ اُس نے اپنی بیٹی کی پرورش میں کوتاہی برتی ہے۔ بہت ساری جگہوں پہ دوشیزگی شادی کی راہ میں رکاوٹ بنتی تھی کیونکہ اس سے خاوند کو اُس رکاوٹ کو توڑنے کا ناخوشگوار عمل کرنا پڑتا جس کے تحت وہ قبیلے کے کسی فرد کا خون نہیں

بہا سکتا تھا۔ بعض اوقات لڑکیاں شادی کے خلاف اس رکاوٹ کو توڑنے کے لئے خود کو کسی اجنبی کے آگے پیش کر دیتیں۔ تبت میں مائیں ایسے مردوں کے لئے تردد کرتیں جو ان کی بیٹیوں کے ساتھ زنا کرے۔ مالابار میں لڑکیاں راہگیروں کی منت کرتیں کہ وہ ایسا کریں کیونکہ جب تک وہ کنواری رہتیں انہیں خاوند نہیں مل سکتا تھا۔ بعض قبیلوں میں دلہن خاوند کے پاس جانے سے پہلے خود کو شادی میں شریک مہمانوں کے حوالے کر دیتی۔ دوسرے قبیلوں میں دولہا کسی شخص کو کرائے پر لیتا تاکہ وہ اُس کی دلہن کی دوشیزگی کو ختم کرے۔ فلپائن کے بعض قبیلوں میں اعلیٰ تنخواہ پر ایک خاص کارندہ اسی کام کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔

وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے دوشیزگی کو جرم کی بجائے پاک دامنی بنا دیا اور تمام بڑی تہذیبوں کے اخلاقی ضابطوں میں یہ ایک اہم عنصر بن گئی۔ بے شک یہ ملکیت کا دستور تھا۔ شادی سے قبل عصمت مالکانہ احساس کی وسعت تھی جس کے تحت پدرسری نظام کا مرد اپنی بیوی اور بیٹیوں کو دیکھتا تھا۔ خرید کی شادی میں جب کنواری لڑکی اپنی غیر کنواری ہم جنس سے زیادہ قیمت دینے لگی تو دوشیزگی کی اہمیت بڑھ گئی۔ اپنے ماضی کی بدولت کنواری لڑکی مرد کو اُس ازدواجی وفاداری کا یقین دلاتی جو مرد کو بہت عزیز تھی۔ اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنی جائیداد ناجائز بچوں کے لئے چھوڑ جائیں۔

مرد نے یہی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرنے کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ کسی بھی معاشرے نے مرد کی قبل از شادی عصمت پر زور نہیں دیا، کسی بھی زبان میں باعصمت مرد کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ دوشیزگی کا وصف بیٹیوں کے لئے مخصوص رکھا گیا اور اس ضمن میں ہزارہا طریقوں سے اُن پر

دبا ڈالا گیا۔ تو رنگی کسی بیٹی یا بہن کو جنسی بے قاعدگی کی سزا موت دیتے تھے۔ نوبیا، حبشہ صومالی لینڈ وغیرہ کے نیگرو نہایت ظالمانہ طریقے سے اپنی لڑکیوں کی شرم گاہوں کے ساتھ چھلے یا تالے لگا دیتے تاکہ مباشرت کو روکا جائے۔ برما اور سیام میں ہمارے عہد تک ایسا ہی رواج رہا خلوت نشینی کی متعدد شکلیں پیدا ہوئیں جن کے ذریعے لڑکیوں کو جنسی ترغیب سے باز رکھا گیا۔ نیو برٹین میں پانچ خطرناک سالوں کے دوران امیر والدین اپنی بیٹیوں کو قید رکھتے اور بوڑھے نیک لوگ اُن کا پہرہ دیتے۔ لڑکیوں کو باہر آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ صرف ان کے رشتہ داران کو مل سکتے تھے۔ بورنیو کے بعض قبائل اپنی غیر شادی شدہ بیٹیوں کو قید تنہائی میں رکھتے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں پردے کا رواج ان غیر متمدن رسموں سے صرف ایک قدم آگے کی بات ہے۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تہذیب اور بربریت میں کتنا قرب پایا جاتا ہے۔

حیا ـــــ دوشیزگی اور پدرسری سوچ کے ساتھ نمودار ہوئی۔ بہت سارے قبیلے آج بھی ایسے ہیں جو اپنا جسم دکھانے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو کپڑے پہننے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ جب لونگ سٹون نے اپنے سیاہ فام میزبانوں سے درخواست کی کہ اُس کی بیوی کی آمد سے پہلے کچھ کپڑے پہن لیں تو سارے افریقہ میں زبردست قہقہے اُبل پڑے۔ بیلونڈا کی ملکہ نے جب لونگ سٹون کے لئے دربار لگایا تو وہ تقریباً عریاں حالت میں تھی۔ قبیلوں کی ایک قلیل اقلیت کسی قسم کی شرم محسوس کئے بغیر کھلے بندوں جنسی تعلقات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عورت کا یہ احساس کہ وہ اپنے 'ایام' میں رکاوٹ ہے عورت کی حیا ہے۔ جب خریدہ کی شادی کا آغاز ہوا اور لڑکی کی دوشیزگی باپ کے لئے منافع کا باعث بنی تو خلوت نشینی اور دوشیزگی کی بندش نے لڑکی میں عصمت کے تحفظ کا احساس پیدا کیا۔ یہاں حیا بیوی کا احساس ہے جو خریدہ کی شادی میں اپنے آپ کو مالی طور پر خاوند کا احسانمند

سمجھتی ہے اور ایسے خارجی جنسی تعلقات سے باز رہتی ہے جن سے اُسے کسی طرح کا معاوضہ نہیں ملتا۔ اس مرحلے پر لباس پہننے کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر پہلے ہی سے زیبائش اور تحفظ کے مقاصد پیدا نہیں ہو چکے تھے۔

بہت سارے قبیلوں میں عورتیں صرف شادی کے بعد لباس پہنتی تھیں جو اس بات کی علامت تھا کہ اُن پر فقط ایک مرد کا اختیار ہے۔ غیر متمدن انسان Penguin Isle کے مصنف سے اتفاق نہیں کرتا کہ پوشاک زناکاری کو شہہ دیتی ہے۔ تاہم پاک دامنی کا پوشاک کے ساتھ کوئی لازمی تعلق نظر نہیں آتا بلکہ بعض سیاح بتاتے ہیں کہ افریقہ میں اخلاق لباس کے معاملے میں معکوس طور پر متغیر ہے۔ یہ بات صاف صاف ظاہر ہے کہ مرد جس بات سے شرم محسوس کرتے ہیں وہ ان کی مقامی بندشوں اور گروہ کی رسموں پر منحصر ہے۔ ماضی قریب تک چینی خواتین اپنے پاؤں، عربی خواتین چہرہ اور ٹوریگ خواتین اپنا منہ دکھا کر شرم محسوس کرتی تھیں۔ لیکن قدیم مصر انیسویں صدی کی ہندوستانی اور بیسویں صدی کی بالی عورتیں اپنی چھاتیوں کی عریانی سے شرم محسوس نہیں کرتی تھیں۔

ان سارے شواہد سے ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ اخلاق بے معنی شے ہے کیونکہ وہ زمان و مکان کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں اور یہ کہ تاریخی علم کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے گروہ کی رسوم کو یک دم ترک کر دیں۔ علم بشریات کی کم علمی خطرناک شے ہے۔ اناطول فرانس کی طنزیہ انداز میں کہی ہوئی بات معقول حد تک صحیح ہے کہ "اخلاقیات کسی معاشرے کے تعصبات کا مجموعہ ہوتی ہے"؛ اور جس طرح یونانی اناکارسس نے کہا ہے اگر کسی گروہ کی تمام مقدس رسوم کو اکٹھا کیا جائے اور پھر کسی گروہ کے نزدیک تمام غیر اخلاقی رسموں کو ان میں سے نکال دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ لیکن یہ اخلاقیات کی بے وقعتی کو ثابت نہیں کرتے

یہ صرف بتاتے ہیں کہ معاشرتی نظم و ضبط کو کن مختلف طریقوں سے یقینی بنایا گیا ہے۔
معاشرتی نظم و ضبط بہت ضروری ہے کیونکہ کھیل کھیلنے کے لئے قوانین کا ہونا ضروری
ہے، انسانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ عام حالات میں ایک دوسرے سے کیا
توقعات رکھنی چاہئیں۔ چنانچہ یہ امر کہ کس معاشرے کے افراد اس کے اخلاقی ضابطے
پر کس یگانگت سے عمل کرتے ہیں، اتنا ہی اہم ہے جتنا اس ضابطے کے مطالب۔
اپنے قبیلے کے دستور و اخلاق کو اضافی جان کر دلیرانہ طور پر اُسے مسترد کر دینا
ہماری ذہنی ناپختگی کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ ایک عمر کے بعد ہم سمجھنا شروع
کر دیتے ہیں کہ گروپ کے اخلاقی ضابطے میں نصابی کتابوں میں پڑھائی جانے
والی اخلاقیات سے زیادہ دانش ہوگی کیونکہ یہ نسل کا تدریجی تجربہ ہے۔ جلد یا
بدیر یہ تکلیف دہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ سچ ہماری فہم سے بالا بھی ہو سکتا
ہے۔ ایسے ادارے، روایات، رسوم و دستور اور قوانین جو کسی معاشرے کا کمپلکس
سٹرکچر بناتے ہیں سینکڑوں صدیوں اور اربوں ذہنوں کی سوچ کا کارنامہ ہوتے
ہیں کسی ذہن کو دس بیس سالوں یا ایک زندگی میں اسے سمجھ لینے کی توقع نہیں
رکھنی چاہیئے۔ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اخلاقیات اضافی اور ناگزیر ہے۔

چونکہ قدیم اور بنیادی رسوم کسی گروہ کی صدیوں کی غلطیوں اور آزمائشوں
کے بعد وجود میں آنے والی اطوار و عادات کے فطری انتخاب کی نمائندگی کرتی
ہیں۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے کہ دوشیزگی اور پاک دامنی میں تاریخی طور پر
اضافی ہونے، خریدہ کی شادی سے متعلق ہونے اور اعصابی امراض میں عمل دخل
رکھنے کے باوجود سماجی منفعت یا قدر بقاء ہے۔ پاک دامنی ایک زبردست
حکمت عملی ہے جس کے ذریعے اگر لڑکی کے پاس اپنے بر کے لئے انتخاب کی
گنجائش ہو، وہ اپنے ساتھی کو زیادہ غور و فکر سے چننے اور اُسے شادی سے

پہلے عمدہ خوبیاں دکھانے پر مجبور کرے۔ چنانچہ مرد کی خواہش کے خلاف اُس نے جو رکاوٹیں کھڑی کیں ان سے رومانوی محبت کے جذبات پیدا ہوئے جس سے اُس کی نظروں میں اُس کی قدروا ہمیت بڑھ گئی۔ دوشیزگی کی تعلیم سے غیر متمدن جنسی زندگی کی آسانی اور فطری پن ختم ہو گیا۔ لیکن فوری جنسی فروغ اور قبل از وقت مادریت کی حوصلہ شکنی کر کے اُس نے معاشی اور جنسی بلوغت کے درمیان فاصلہ کم کر دیا جو تہذیب کی ترقی کے ساتھ خوفناک حد تک بڑھ رہا تھا۔ غالباً اس طریقے سے اس نے فرد کو جسمانی اور ذہنی طور پر مضبوط بنایا، بچپن اور اس کی تربیت کا عہد بڑھ گیا اور نسل کا درجہ بلند ہو گیا۔

جوں جوں ملکیت کا ادارہ ترقی کرتا گیا زنا گناہِ صغیرہ سے گناہِ کبیرہ بن گیا۔ غیر متمدن انسانوں کی نصف تعداد اسے اہمیت نہیں دیتی تھی۔ ملکیت کے آغاز کے ساتھ نہ صرف عورت سے مکمل وفا طلب کی گئی بلکہ مرد کا اُس کی طرف مالکانہ رویہ پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ جب کسی مہمان کو اُدھار دی جاتی تو اس لئے کہ وہ مکمل طور پر اپنے مرد کی ملکیت ہوتی تھی۔ ستی کی رسم اس تصور کی تکمیل تھی۔ عورت کو اپنے آقا کی دیگر ملکیت کے ساتھ اس کی قبر میں جانا چاہیئے۔ پدر سری نظام میں زنا چوری کے زمرے میں آتا تھا اور یہ ایک بڑا جرم تھا۔ اس کی سزا سادہ قبیلوں کی بے تعلقی سے لے کر زانیہ کی انتڑیاں نکال دینے تک تھی۔ صدیوں کی سزا کے بعد عورت کی بیوی والی وفاداری مکمل طور پر قائم ہو گئی اور اس سے عورت کے دل میں ایک سچی دیانت پیدا ہو گئی۔ بہت سارے ہندوستانی قبائل کے فاتحین عورتوں کی پاکدامنی سے حیران ہو جاتے۔ بعض مرد سیاحوں نے اُمید ظاہر کی ہے کہ یورپ اور امریکہ کی عورتیں کسی دن زولو اور پاپوؤں کی

بیویوں کی ازدواجی وفاداری کے ہم پلہ ہو سکیں گی۔

یا پوڈں کے لئے یہ زیادہ آسان تھا کیونکہ بہت سی غیر متمدن قوموں کی طرح ان میں مرد کی طرف سے عورت کو طلاق میں رکاوٹیں نہیں تھیں۔ امریکی انڈینز میں شادیاں چند ہی سالوں تک چلتی تھیں۔ سکول کرافٹ کہتا ہے "بوڑھی اور درمیانی عمر کے مردوں کی بہت ساری بیویاں تھیں اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے بچے ان سے ناواقف تھے" وہ یورپی لوگوں پر ہنستے ہیں کہ وہ ساری عمر کے لئے ایک ہی بیوی رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نیک روح نے انہیں عشرت کے لئے پیدا کیا ہے اور جب تک مزاج اور طبیعت موافق نہ ہوں وہ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ چیروکی کے لوگ سال میں تین یا چار مرتبہ بیویاں بدلتے تھے، سموآن کے قدامت پسند انہیں تین سال تک رکھتے تھے

مقیم زرعی زندگی کے ساتھ شادیاں زیادہ پائیدار ہو گئیں۔ پدری نظام میں مرد عورت کو طلاق دینا معاشی طور پر نقصان دہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس سے وہ ایک نفع بخش غلام کھو دیتا تھا۔ جب خاندان معاشرے کی پیداواری اکائی بن گیا اور زمین کی مشترکہ کاشت کے ذریعے یہ اپنے سائز اور اتصال کے مطابق خوشحال ہو گیا تو یہ بات مفید خیال کی گئی کہ آخری بچے کی پرورش تک میاں بیوی کا تعلق جاری رہے۔ اس وقت تک نئے رومانس کے لئے توانائی باقی نہ رہی اور مشترکہ محنت اور تکالیف سے والدین کی زندگیاں ایک ہو گئیں۔ شہر کی صنعتی زندگی میں اضافے اور اس کے نتیجے میں خاندان کے سائز میں کمی اور معاشی اہمیت سے طلاق دوبارہ عام ہو گئی۔

عموماً ساری انسانی تاریخ کے دوران مرد نے زیادہ بچوں کی خواہش کی چنانچہ ماں کو مقدس کہا گیا جبکہ عورت نے جو تولید کے عمل سے زیادہ واقفیت رکھتی ہے: اس سخت آزمائش کے خلاف خفیہ طور پر بغاوت کر لی اور زچگی کے بوجھ کو کم کرنے

کے لئے متعدد ذرائع استعمال کیئے۔ غیر متمدن انسان عموماً آبادی کو روکنے کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ عام حالات میں بچے سود مند ثابت ہوتے اور مرد صرف اس بات پہ افسوس کا اظہار کرتا کہ وہ تمام بیٹے نہیں ہو سکتے۔ عورت اسقاطِ حمل، طفل کشی اور مانع حمل کے طریقے ایجاد کرتی ہے۔ مؤخر الذکر غیر متمدن انسان میں بھی واقع ہوتا تھا۔ یہ بات حیران کن ہے کہ پیدائش کے عمل کو روکنے کے لئے "وحشی عورت" "مہذب عورت" جیسی ہی ہے۔ بچے کی پرورش کے بوجھ سے گریز، جوانی کے خدوخال قائم رکھنا، ناجائز بچے کی ماں بننے کی بے عزتی سے بچنا، موت سے بچنا وغیرہ۔ زچگی کو کم کرنے کا آسان ترین طریقہ بچے کی شیر خواری کے دوران مرد کے ساتھ مباشرت سے انکار ہے جو کئی سالوں تک جاری رہ سکتا ہے۔ بعض اوقات، جیسا کہ چائنی انڈنیز میں ہوتا۔ عورت اس وقت تک دوسرا بچہ پیدا کرنے سے انکار کرتی جب تک پہلا بچہ دس سال کا نہ ہو جاتا۔ نیو برٹن میں عورت شادی کے دو یا چار سال بعد تک بچہ پیدا نہیں کرتی تھی۔ برازیل کے گیا کراس قبیلے کی آبادی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی کیونکہ عورت تیس سال کی عمر تک بچہ پیدا نہیں کرتی تھی۔ پاپوؤں میں اسقاطِ حمل کا بہت رواج تھا۔ عورتیں کہتی تھیں "بچے گرانبار ہوتے ہیں ہم ان سے تنگ ہیں ہم مر جاتی ہیں"۔ بعض ماوری قبیلے حمل روکنے کے لئے جڑی بوٹیاں اور مصنوعی طریقے استعمال کرتے تھے۔

جب اسقاطِ حمل ناکام ہو گیا، طفل کشی جاری ہو گئی۔ زیادہ تر فطری قومیں بدہئیت، بیمار، حرامی بچے یا وہ بچے جن کی ماں پیدائش کے وقت مر جاتی، مارنے کی اجازت دے دیتیں۔ زندہ رہنے کے موجود ذرائع کے مطابق آبادی کو محدود کرنے کی کوئی بھی وجہ درست ہو سکتی تھی۔ بہت سے قبیلے ایسے بچوں کو مار دیتے جن کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ وہ برے حالات میں پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ بونداآی

کے باشندے ان تمام بچوں کا گلا گھونٹ دیتے جن کا سر پہلے دنیا میں آتا۔ کام چڈل ایسے بچوں کو مار دیتے جو طوفانی موسم میں پیدا ہوتے۔ مدگاسکر قبیلے کے لوگ مارچ یا اپریل، بدھ اور جمعہ کے دن یا مہینے کے آخری ہفتے میں پیدا ہونے والے بچوں کو ڈبو دیتے تھے یا زندہ دفن کر دیتے۔ اگر کوئی عورت جڑواں بچے پیدا کرتی تو بعض قبیلوں میں اسے زنا کا ثبوت سمجھا جاتا کیونکہ کوئی آدمی ایک وقت دو بچوں کا باپ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایک یا دونوں بچے موت کے گھاٹ اُتار دیئے جاتے۔ طفل کشی کا رواج خاص طور پر خانہ بدوشوں میں پایا جاتا تھا جو اپنے طویل سفر کے دوران بچوں کو مصیبت سمجھتے تھے۔ وکٹوریہ کا بنگیرینگ قبیلہ پیدا ہونے والے بچوں میں سے نصف کو پیدائش پر مار دیتا۔ پراگوائے چاکو کے لینگوا سات سال میں ایک بچے کی اجازت دیتا تھا۔ ایٹے پونی آبادی میں کفایت ہر گھر میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی اجازت سے کرتے اور دوسرے بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتے۔ جہاں قحط کے حالات ہوتے یا کوئی خطرہ درپیش ہوتا، بہت سے قبیلے نوجوان کا گلا گھونٹ دیتے اور بعض قبیلے اُنہیں کھا جاتے۔ طفل کشی کا نشانہ زیادہ تر لڑکی بنتی کبھی کبھار اُسے اذیت دے کر مارا جاتا تاکہ اگلے جنم میں اُس کی روح لڑکے کے جسم میں آئے۔ طفل کشی ظلم اور پچھتاوے کے احساس کے بغیر کی جاتی کیونکہ ماں نومولود کی پیدائش کے فوراً بعد جبلتاً محبت محسوس نہیں کرتی۔

اگر بچہ کچھ دنوں کے لئے زندہ بچ جاتا تو وہ طفل کشی سے محفوظ ہو جاتا، جلد ہی اس کی بے چارگی اور معصومیت سے والدین کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی اور غیر متمدن والدین اعلیٰ قوموں کے بچے کی نسبت اس سے زیادہ محبت کا سلوک کرتے۔ دودھ یا نرم غذا کی کمی کی بدولت ماں دو سے چار سال تک اور بعض اوقات بارہ سال تک بچے کو دودھ پلاتی۔ ایک سیاح نے ایسے لڑکے کا ذکر کیا

ہے جس نے دودھ چھوڑنے سے پہلے تمباکو نوشی سیکھ لی تھی۔ اکثر ایک لڑکا دوسرے کے ساتھ کھیل کے دوران اپنی ماں کا دودھ پینے چلا جاتا۔ نیگرو ماں کام کے دوران اپنے بچے کو پیٹھ پر لادلیتی اور بعض اوقات کاندھوں کے اوپر سے چھاتیاں پیچھے ڈال کر بچے کو دودھ پلاتی۔ غیر متمدن نظم و ضبط شفیق مگر تباہ کن نہیں تھا کم عمری میں بچے کو اپنی حماقت، بدتمیزی یا جارحیت کے نتائج بھگتنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا اس طرح تربیت جاری رہتی۔ فطری معاشروں میں والدین اور بچوں کی محبت بہت فروغ پا چکی تھی۔

غیر متمدن قوموں کے بچوں میں خطرہ اور بیماری کا سامنا زیادہ تھا۔ لہذا شرح اموات بھی زیادہ تھی۔ نوجوانی کا عرصہ مختصر ہوتا کیونکہ کم عمری میں شادی اور حربی ذمہ داریاں شروع ہو جاتیں اور جلد ہی فرد گروہ کا دفاع کرنے کے بڑے کاموں میں گم ہو جاتا۔ عورتیں بچوں کی پرورش اور مرد انہیں زندہ رکھنے میں خرچ ہو جاتے۔ جب سب سے چھوٹا بچہ پرورش پاتا تو والدین بھی بوڑھے ہو چکے ہوتے۔ چنانچہ خاتمے اور آغاز میں انفرادی زندگی کے لئے کم گنجائش تھی۔ آزادی کی طرح انفرادیت بھی تہذیب کا تعیش ہے۔ تاریخ کے آغاز کے بعد ہی مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد بھوک، تولید اور جنگ کے بوجھ سے آزاد ہوتی، چنانچہ فراغت میں کلچر اور آرٹ کے عظیم نمونے تخلیق کیئے گئے۔

III سماجی اخلاقیات

اخلاقی ضابطوں کو نئی نسل تک منتقل کرنا بھی والدین کے فرائض کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ بچہ انسان کم اور حیوان زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں نسل کی اخلاقی

اور ذہنی وراثت کے ذریعے انسانیت روز بروز داخل کی جاتی ہے۔ حیاتیاتی طور پر بچہ تہذیب کے لئے زیادہ موزوں نہیں ہوتا کیونکہ اس کی جبلتیں اسے صرف روایتی اور بنیادی حالات کا سامنا کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ اس میں ایسے میلانات بھی ہوتے ہیں جو شہر کی نسبت جنگل کے لئے زیادہ موافق ہوتے ہیں۔ ہر برائی ایک عہد میں نیکی تھی اور جہد بقاء کے لئے ضروری تھی لیکن جب یہ ان حالات کے گزرنے کے بعد بھی زندہ رہ گئی جنہوں نے اسے ناگزیر بنایا تھا تو یہ برائی بن گئی۔ چنانچہ برائی کردار کی کوئی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے بلکہ عموماً قدیم اور پرانے عادات واطوار کی طرف پلٹنا ہے۔ اخلاقی ضابطے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نا متبدل یا بتدریج تغیر پذیر انسانی فطرت کے ہیجانات کو معاشرتی زندگی کی متغیر ضرورتوں اور حالات کے مطابق بنائے۔

لالچ، اکتسابیت، بے ایمانی، ظلم اور تشدد جانوروں اور انسانوں کی بہت ساری نسلوں میں بہت مفید تھا جسے ہمارے تمام قوانین، تعلیم، اخلاقیات اور مذاہب ختم نہ کر سکے۔ ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ جانور خوب ٹھونس کر کھاتا ہے کیونکہ اُسے معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے دوبارہ کھانا کب ملے گا۔ یہ بے یقینی لالچ کی بنیاد ہے۔ یاقوت ایک دن میں چالیس پونڈ گوشت کھاتے تھے۔ ایسی ہی کہانیاں اسکیموؤں اور آسٹریلیا کے باشندوں کے بارے میں مشہور ہیں۔ معاشی تحفظ اس فطری لالچ کو ختم کرنے کے لئے تہذیب کا بہت جدید کارنامہ ہے۔ کیونکہ یہ اب بھی ناقابلِ تسکین اکتسابیت میں نمودار ہوتا ہے۔ جدید جدید ترین انسان (مردوزن) سونا یا دوسری اشیاء اکٹھی کر لیتا ہے جو ہنگامی حالات میں غذا مہیا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پانی کے لئے اتنا لالچ نہیں کیا جاتا جتنا کھانے کے لئے کیا جاتا ہے کیونکہ انسانوں کی زیادہ آبادیاں پانی کے ارد گرد ہی جمع ہوئیں ~~اسی طرح~~ نشہ آور مشروبات بھر گئے ہوں۔ اس لئے نہیں کہ انسان لالچی ہے بلکہ اس لئے کہ اُسے بری لگتی ہے

اور وہ گرم ہونا چاہتا ہے یا وہ پریشان ہوتا ہے اور اپنی پریشانی فراموش کرنا چاہتا ہے یا شاید اس لئے کہ جو پانی اُسے میسر ہے وہ پینے کے لئے موزوں نہیں ہے۔

بے ایمانی لالچ کے مقابلے میں نئی ہے کیونکہ بھوک جائیداد سے قدیم ہے۔ سادہ ترین غیر متمدن انسان سب سے زیادہ ایماندار تھے۔ کولبن ہوٹنٹاٹوں کے متعلق لکھتا ہے "ان کے کہے ہوئے الفاظ مقدس ہوتے تھے۔ وہ یورپ کی بے ایمانی اور بے اعتباری کے فنون کے متعلق نہیں جانتے" جیسے جیسے بین الاقوامی ابلاغ بہتر ہوا سادہ لوح ایمانداری غائب ہوگئی۔ یورپ نے ہوٹنٹاٹوں کو بے ایمانی کا شریف فن سکھا دیا۔ عموماً بے ایمانی تہذیب کے ساتھ بڑھتی ہے کیونکہ تہذیب کے ساتھ موقع شناسی کے خطرات زیادہ ہوتے ہیں۔ چرانے کے لئے اشیاء زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں اور تعلیم انسان کو چالاک بنا دیتی ہے۔ جب غیر متمدن انسان میں جائیداد ترقی کرتی ہے تو جھوٹ اور چوری اُس کی تربیت میں شامل ہو جاتی ہے۔

تشدد کے جرائم بھی لالچ جتنے ہی پُرانے ہیں۔ غذا، زمین اور بیوی کے لئے جدوجہد نے ہر نسل میں زمین کو خون سے سیراب کیا اور تہذیب کی متلون روشنی کے لئے تاریک پس منظر فراہم کیا۔ غیر متمدن انسان ظلم کرنے پر مجبور تھا کیونکہ اُسے زندگی نے یہی سکھایا تھا کہ اُس کے پاس ہر وقت ہتھیار ہو اور اس کا دل قتل و غارت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ بشری تاریخ کا تاریک ترین حصہ غیر متمدن اذیت اور اس سرخوشی کی کہانی ہے جو غیر متمدن مرد اور عورتیں اُس تکلیف و اذیت سے حاصل کرتے تھے۔ یہ ظلم زیادہ تر جنگ سے تعلق رکھتا تھا جبکہ قبیلے کے اندر عادات و اطوار کم خون آشام ہے۔ غیر متمدن انسان اپنے قبیلے کے افراد حتیٰ کہ غلاموں کے ساتھ شفقت سے پیش آتا تھا۔ لیکن چونکہ انسان کو جنگ میں شدید قتل و غارت کرنی ہوتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے امن کے وقت بھی قتل کرنا سیکھ لیا۔

کیونکہ کئی غیر متمدن ذہنوں میں باہم مذاکرات سے تنازعہ حل نہ ہوتا جب تک متنازعہ فریقین میں سے ایک مر نہ جاتا۔ بہت سارے قبیلوں میں ایک جرگے کے دوسرے فرد کا قتل اتنا پریشان کن نہیں ہوتا تھا جتنا یہ ہمارے عہد میں ہے۔ اہلِ فیوجی قاتل کو یہ سزا دیتے کہ اُسے قبیلے کی حدود سے باہر نکال دیتے جب تک کہ اُس کے ساتھی اُس کا جرم نہ بھول جاتے اُسے قبیلے میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوتی۔ کافر قاتل کو پلید خیال کرتے اور مطالبہ کرتے کہ اُسے اپنا چہرہ تارکول سے کالا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ کو صاف کر لیتا اور چہرے کا رنگ براؤن کر لیتا تو اُسے دوبارہ سماج میں جگہ مل جاتی۔ ہمارے اپنے عہد کی طرح فیوٹاتا کے وحشی قاتل کو ہیرو کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ متعدد قبیلوں میں کوئی عورت اُس وقت تک کسی مرد سے شادی نہیں کرتی تھی جب تک اُس نے جائز یا ناجائز طریقے سے کسی شخص کو قتل نہ کیا ہو۔ چنانچہ سر کا شکار کرنے کا دستور آج بھی فلپائن میں موجود ہے۔ وہ ڈیاک جو ایسے شکار میں سب سے زیادہ سر اُتار لاتا وہ اپنے گاؤں کی کسی بھی لڑکی کو منتخب کر کے شادی کر سکتا تھا۔ وہ اس کی نظرِ عنایت کی طلبگار تھیں کیونکہ اس کے پیچھے یہ احساس کارفرما تھا کہ اُس کے ذریعے وہ بہادر اور مردِ مار قسم کے بچوں کی ماں بن سکیں گی۔

جہاں غذا مہنگی ہوتی ہے وہاں زندگی سستی ہوتی ہے۔ اسکیموؤں کے بیٹے بے بس اور ناکارہ ہونے پر اپنے والدین کو جان سے مار ڈالتے انہیں قتل کرنے میں ناکامی اولاد کے فرائض میں کوتاہی تصور کی جاتی۔ حتیٰ کہ غیر متمدن انسان کو اپنی زندگی بہت سستی لگتی تھی کیونکہ وہ خود کو برضا قتل کر دیتا۔ جس کا مقابلہ صرف جاپانیوں نے کیا۔ اگر ایک مظلوم شخص خودکشی کر لیتا یا خود کو نقصان پہنچاتا تو ظالم کو یا تو اُس کی نقل کرنی ہوتی

یا اُسے قبیلے سے نکال دیا جاتا۔ خودکشی کے لئے کوئی بھی وجہ کافی ہو سکتی ہے۔ بعض شمالی امریکی انڈین خواتین اپنے مردوں کے بُرا بھلا کہنے پر خودکشی کر لیتی تھیں اور تروبریانڈ جزیرے کے ایک نوجوان نے محض اس لئے خودکشی کر لی کہ اُس کی بیوی نے اُس کا سارا تمباکو پی لیا تھا۔

لالچ کو کفایت شعاری، تشدد کو استدلال، قتل کو قانونی چارہ جوئی اور خودکشی کو فلسفے میں تبدیل کرنا تہذیب کے مقاصد کا حصہ رہا ہے۔ جب طاقت ور نے کمزور کو قانونی طریقے سے کھانا شروع کیا تو ایک لحاظ سے یہ بہت بڑی ترقی تھی۔ کوئی بھی معاشرہ اس صورت میں قائم نہیں رہ سکتا اگر وہ اپنے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اُسی سلوک کی اجازت دے دے جو وہ دوسرے گروہوں کے ساتھ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ خارجی مقابلے کے لئے داخلی تعاون پہلا قانون ہے۔ جہدِ بقاء امدادِ باہمی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ گروہ کو منتقل کی جاتی ہے۔ دوسرے حالات کے ساتھ ساتھ دشمن گروہوں سے مقابلہ کرنے کی اہلیت متحد ہونے کی انفرادی اور خاندانی اہلیت کے متناسب ہوگی۔ چنانچہ ہر معاشرہ ایک اخلاقی ضابطہ سکھاتا ہے اور فرد کے اندر معاشرتی مزاج پیدا کرتا ہے جو زندگی کی فطری جنگ کو دباتا ہے۔ ان خوبیوں یا عادات کو جو معاشرے کے لئے فائدہ مند ہوتی ہیں اچھائیاں کہہ کر فرد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جبکہ ان کے برعکس عادات کو برائیاں کہہ کر ان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اس طرح فرد خارجی اعتبار سے معاشرتی انسان اور جانور شہری بن جاتا ہے۔

جدید انسان کی نسبت 'وحشی' کی روح میں معاشرتی جذبات پیدا کرنا مقابلتاً آسان تھا۔ جہدِ حیات سے اشتراکیت کا ظہور ہوا جب کہ ملکیت

کی جدوجہد نے انفرادیت کی راہ ہموار کی۔ غالباً غیر متمدن انسان ہمعصر انسان کے مقابلے میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے زیادہ آمادہ رہتا تھا، اس میں سماجی یگانگت زیادہ پیدا ہوئی کیونکہ اسے زیادہ خطرات کا سامنا تھا اور اس کے اپنے گروہ کے ساتھ زیادہ مفادات وابستہ تھے۔ اُس کے پاس ملکیت کم تھی جو اُسے دوسرے ساتھیوں سے جدا کرتی۔ فطری انسان زود رنج اور لالچی تھا، لیکن وہ مہربان اور فیاض بھی تھا۔ اجنبیوں کے ساتھ شراکت پر اور مہمانوں کو تحفے دینے میں خوشی محسوس کرتا۔ یہاں تک کہ سکول کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ بہت سے غیر متمدن قبیلوں میں مہمان نوازی اس انتہا پر تھی کہ میزبان اپنے مہمان کو بیوی یا بیٹی پیش کر دیتا تھا۔ ایسی پیشکش کو ٹھکرانا نہ صرف میزبان بلکہ اس عورت کی بھی ہتک شمار ہوتی۔ مشنریوں کو ایسے ہی ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ عورت کو مسترد کرنے کا عمل اس انداز سے متعین ہوتا تھا جس کے مطابق مہمان سونپی گئی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ غیر متمدن انسان جنسی حسد کے ساتھ نہیں بلکہ ملکیت کے تصور کے ساتھ جیتا تھا۔ اُسے یہ بات پریشان نہیں کرتی تھی کہ اُس کے پاس آنے سے پہلے اس کی بیوی کے دوسروں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات تھے یا اب وہ اس کے مہمان کے پاس سوئی ہوئی ہے وہ اس کا مالک تھا نہ کہ عاشق۔ اُسے جو چیز پریشان کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اس کی مرضی کے بغیر یا اپنی مرضی سے کسی اور انسان کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ بعض افریقی خاوند اجنبیوں کو کچھ رقم یا اشیاء کے بدلے اپنی بیویاں اُدھار دے دیتے۔

تواضع کے اصول قدیم انسانوں میں بھی اتنے ہی پیچیدہ تھے جتنے ترقی یافتہ انسانوں میں۔ ہر گروہ کے سلام اور الوداعی طریقے تھے۔ دو افراد ایک دوسرے سے

ملتے ہوئے آپس میں ناک رگڑتے، ایک دوسرے کو سونگھتے یا ایک دوسرے کو نرمی سے کاٹتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کبھی چومّا نہیں کرتے تھے۔ بعض گنوار قبیلے جدید انسان کے مقابلے میں زیادہ شائستہ تھے۔ بتایا گیا ہے کہ کھوپڑیوں کا شکار کرنے والے ڈیاک اپنی خانگی زندگی میں نہایت شریف اور پُرامن تھے۔ اسی طرح وسطی امریکہ کے انڈین سفید فاموں کی اونچی گفتگو اور اکھڑ رویے کو بُری تربیت اور غیر متمدن کلچر کی نشانیاں سمجھتے تھے۔

تقریباً تمام گروہ دوسرے گروہ کو خود سے گھٹیا خیال کرتے۔ امریکی انڈین خود کو منتخب انسان سمجھتے جنہیں عظیم روح نے نسلِ انسانی کی سربلندی کے لئے پیدا کیا تھا۔ ایک ہندوستانی قبیلہ خود کو "لاشریک انسان" سمجھتا تھا۔ ایک اور قبیلہ خود کو "انسانوں کے انسان" سمجھتا تھا۔ کیریب کہتے "صرف ہم انسان ہیں"۔ اسکیموؤں کا یقین تھا کہ اہلِ یورپ گرین لینڈ میں عادات واطوار اور اچھائیاں سیکھنے آئے ہیں۔ نتیجتاً غیر متمدن انسان کو کبھی احساس نہیں ہوا کہ دوسرے قبیلوں کے متعلق بھی وہ اخلاقی پابندیاں عائد کر دے جو وہ اپنے قبیلے کے متعلق روا رکھتا تھا۔ وہ اسے اخلاق کا وظیفہ سمجھتا تھا کہ دوسرے گروہوں کے خلاف اپنے گروہ کو قوت اور اتحاد مہیا کرے۔ احکام اور رکاوٹوں کا اطلاق صرف اُس کے اپنے قبیلے پر ہوتا تھا۔ دوسرے قبیلوں کے ساتھ، اگر وہ اس کے مہمان نہ ہوں، وہ جہاں تک چاہتا جا سکتا تھا۔

تاریخ میں اخلاقی ترقی اخلاقی ضابطوں کی اصلاح سے زیادہ اس علاقے کی توسیع پر منحصر ہے۔ جس میں اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جدید انسان کی اخلاقیات لازمی طور پر غیر متمدن انسان سے اعلیٰ نہیں۔ اگرچہ دو ضابطوں کے گروہ اپنے موضوع، عمل اور پیشے میں ایک دوسرے سے خاصے مختلف

ہو سکتے ہیں، لیکن جدید اخلاق کو عام حالات میں پہلے کی نسبت زیادہ انسانوں تک وسعت دی جا سکتی ہے۔ جوں جوں قبیلے زیادہ بڑی وحدت ـــــ ریاست میں اکٹھے ہوتے گئے اخلاقیات قبائلی حد بندیوں سے باہر نکل گئیں اور جوں جوں ذرائع ابلاغ اور مشترکہ خطرے سے ریاستیں متحد ہوئیں تو اخلاق سرحدوں سے باہر نکلا اور بعض افراد اپنے احکام کا اطلاق تمام یورپیوں، تمام سفید فاموں اور آخرکار تمام انسانوں پر کرنے لگے۔ غالباً ہر دور میں تصوریت پسند رہے ہیں جو اپنے ہمسایوں کی طرح تمام انسانوں سے محبت کرنے کے خواہشمند ہیں اور شاید ہر نسل میں وہ قومیت پسندی اور جنگ کے دشت میں گونجنے والی غیر مؤثر آوازیں ہیں۔ لیکن شاید ایسے انسانوں کی تعداد نسبتاً بڑھ گئی ہے۔ موقع پرستی میں اخلاق روا نہیں رکھا جاتا لیکن بین الاقوامی تجارت میں ایسا ہوتا ہے کیونکہ ایسی تجارت پابندی، ضابطے اور اعتماد کے بغیر ناممکن ہے۔ تجارت قذاقی سے شروع ہوئی اور اخلاقیات کے سہارے اپنے نقطہ عروج پر پہنچی۔

بہت کم معاشروں نے اپنے اخلاقی ضابطے کی بنیاد معاشی اور سیاسی افادے پر رکھی۔ کیونکہ فرد کو فطرت کی طرف سے ایسا مزاج نہیں ملا کہ اپنی شخصی دلچسپیاں گروہ کے مفادات کے ماتحت کر دے یا پریشان کن ضابطوں کی پابندی کرے جن کے نفاذ کے لئے محسوس ذرائع نہ ہوں۔ معاشی محرکات کو انفرادی محرکات کے مقابلے میں مضبوط کرنے کے لئے ایک غیر مرئی نگہبان کو مقرر کر کے معاشروں نے مذہب کو ایجاد نہیں کیا بلکہ اس کا استعمال کیا ہے۔ انیس سو سال پہلے قدیم زمانے کے ماہر جغرافیہ دان نے اس موضوع پر بہت اعلیٰ خیالات پیش کیئے۔

"عورتوں کے ہجوم اور آزاد جنسیت پسند گروہ سے نمٹنے کے لئے ایک فلسفی انہیں محض دلیل کے ذریعے احترام، تقویٰ اور اعتقاد کا درس نہیں دے سکتا۔ اس کے لئے مذہبی خوف کی ضرورت ہے جو دیو مالا اور معجزات کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ بجلی کی کڑک، ترشول، ملیتے، سانپ، سونٹا، نیزے دیوتاؤں کے ہتھیار ـــــ سب دیو مالا ہے اور ساری قدیم الہیات اس سے بھری پڑی ہے۔ لیکن ریاستوں کے قائم کرنے والوں نے سادہ ذہنوں کو مرعوب کرنے کے لئے ان تمام چیزوں کی اجازت دی۔ دیو مالا کی خاصیت لوگوں کو مرعوب کرنا ہے اور زندگی کے معاشرتی اور خانگی نظام اور حقیقی واقعات کی تاریخ میں اس کا حصہ ہے۔ قدیم لوگ ایسے ہی بچوں کی تعلیم کرتے اور بڑی عمر تک اس کا اطلاق کرتے تھے وہ سمجھتے کہ شاعری کے ذریعے زندگی کے ہر حصے کی اطمینان بخش تنظیم کر سکتے تھے۔ لیکن ایک لمبے عرصے کے بعد اب تاریخ کے متعلق تحریر اور موجودہ فلسفہ سامنے آیا ہے تاہم فلسفہ خواص کے لئے ہے اور شاعری زیادہ لوگوں کے لئے مفید ہے۔"

چنانچہ اخلاقیات پر جلد ہی مذہب کی مہر لگ جاتی ہے کیونکہ مذہبی سوانگ اور مافوق الفطرت عناصر ایسا اثر ڈالتے ہیں۔ جو تجربی اور تکوینی طور پر نہیں ہو سکتا۔ انسان پر سائنس کی نسبت تخیل کی حکمرانی آسان ہے۔ لیکن کیا یہ اخلاقی افادیت مذہب کا نقطہ آغاز تھی۔

IV مذہب

غیر متمدن ملحدین

اگر مذہب کی تعریف یوں کی جائے کہ یہ مافوق الفطرتی قوتوں کی عبادت کا نام ہے تو ہمیں فوراً پتہ لگے گا کہ بعض لوگوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ افریقی بونوں کے بعض قبائل کا کوئی عقیدہ یا مذہبی رسم نہیں تھی، نا ہی ان کا کوئی ٹوٹم تھا اور نا ہی دیوتا۔ وہ اپنے مردوں کو بغیر رسم کے دفن کرتے اور ان پر مزید توجہ نہیں دیتے تھے۔ ان میں اوہام بھی کم تھے۔ یہ تمام معلومات سیاحوں کی فراہم کردہ ہیں۔ کیمیرون کے ٹھگنے صرف بد دیوتاؤں کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن انہیں خوش کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سیلون کے ویدھا دیوتاؤں اور لافانی روحوں کو تسلیم کرتے تھے لیکن وہ عبادت یا قربانی پیش نہیں کرتے تھے۔ جب ان سے خدا کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ جدید فلسفی کی طرح پریشان ہو کر پوچھتے "کیا وہ کسی چٹان پر ہے؟ کسی پہاڑ پر؟ کسی درخت پر؟ میں نے کبھی بھی کسی خدا کو نہیں دیکھا ہے؟" شمالی امریکی انڈینز میں خدا کا تصور تو تھا لیکن وہ اس کی عبادت نہیں کرتے تھے، ایپکورس کی مانند وہ اسے اتنا دور سمجھتے تھے کہ اس کا ان کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ابی پون انڈین کسی مابعد الطبیعاتی محقق کو کنفیوشش کے لہجے میں جھڑک دیتے۔ "ہمارے باپ دادوں نانوں اور ان کے دادوں نانوں نے صرف زمینی معاملات کے متعلق سوچا" وہ صرف اس بات کے لئے متفکر تھے کہ ہموار زمین پر گھاس اُگے اور ان کے

گھوڑوں کو پانی ملے، انہیں کبھی یہ پریشانی لاحق نہیں ہوتی تھی کہ آسمانوں پر کیا ہو رہا ہے اور ستاروں کا خالق و حاکم کون ہے۔ اسکیموؤں سے جب پوچھا جاتا کہ زمین و آسمان کس نے بنائے ہیں تو وہ ہمیشہ جواب دیتے "ہمیں نہیں معلوم" ایک زدکوہ سے پوچھا گیا کہ "تم سورج کو طلوع اور غروب ہوتے اور درختوں کو اُگتے دیکھتے ہو، تم جانتے ہو کہ کس نے انہیں بنایا اور ان کا خالق کون ہے؟" وہ سادگی سے جواب دیتا "نہیں ہم انہیں دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کیسے وجود میں آئے۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ وہ خود بخود وجود میں آئے۔"

ایسے معاملات بہت کم ہیں اور مذہب کی آفاقیت کا پرانا عقیدہ زیادہ درست ہے۔ ایک فلسفی کے لئے یہ تاریخ اور نفسیات کے بڑے حقائق میں سے ایک ہے کیونکہ وہ محض یہ جاننے پر ہی اکتفا نہیں کرتا کہ مذاہب میں بے معنی باتیں ہیں بلکہ اس کی دلچسپی کا باعث عہدِ قدیم کے مسائل اور عقیدے کی ثابت قدمی ہے۔ نسلِ انسانی کی پارسائی کے ذرائع کیا ہیں؟

۱۔ مذہب کے ماخذ

لکریشس کے خیال میں خوف ـــــ دیوتاؤں کا اوّلین سرچشمہ تھا۔ خوف ـــــ خاص طور پر موت کا خوف، غیر متمدن زندگی ہزاروں خطرات سے پُر تھی اور کم ہی فطری موت کا سامنا ہوتا تھا۔ بڑھاپے سے پہلے ہی تشدد یا کوئی عجیب و غریب بیماری انسانوں کی اکثریت کو کھا جاتی تھی۔ چنانچہ قدیم انسان کو اس بات پر یقین نہیں تھا کہ موت فطری چیز ہے وہ اسے مافوق الفطرت گماشتوں کا کیا دھرا سمجھتا تھا۔ نیو برٹن کے باشندوں کی دیومالا کے مطابق انسان کو دیوتاؤں کی غلطی کی وجہ سے موت آتی تھی۔ اچھے دیوتا کیمبیانا نے اپنے احمق بھائی کورووا کو

بتایا" انسانوں کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ اپنی کھالیں اتار لیں۔ اس طرح وہ موت سے بچ جائیں گے۔ لیکن سانپوں سے کہو کہ انہیں اب مرنا پڑے گا"۔ کوروّا نے پیغام غلط پہنچائے۔ اس نے لافانیت کا راز سانپوں کو دے دیا جبکہ موت انسانوں کو۔ بہت سارے قبیلے یہ سمجھتے تھے کہ موت کھال کے ٹکڑ جانے کی وجہ سے آتی ہے اور اگر انسان اپنی کھال تبدیل کر سکے تو وہ کبھی نہیں مرے گا۔

موت کا خوف، اتفاقی واقعات اور ناقابلِ فہم معاملات پر حیرانی، الٰہی مدد کی امید اور اچھی قسمت کے لئے تشکر نے مذہبی عقیدے کو پیدا کیا۔ حیرانی اور تجسس بالخصوص سیکس اور خوابوں میں موجود ہوتے تھے۔ جبکہ انسان اور زمین پر پُراسرار آسمانی وجود کا اثر تھا۔ غیر متمدّن انسان خوابوں میں نظر آنے والی وہمی صورتوں پر حیران رہ جاتا اور جب اپنے خوابوں میں ان انسانوں کو دیکھتا جنہیں وہ جانتا تھا کہ مر چکے ہیں تو وہ خوفزدہ ہو جاتا۔ وہ مُردوں کو زمین میں دفن کرتا تاکہ واپس نہ آ سکیں۔ وہ لاش کے ساتھ اُس کا سامان اور خوراک بھی دفن کر دیتا مبادا وہ اس کی تلاش میں واپس آئے اور اُسے بُرا بھلا کہے۔ بعض اوقات جس گھر میں موت واقع ہوتی اُسے لاش کے لئے چھوڑ دیا جاتا اور اپنے لئے کوئی اور جائے پناہ ڈھونڈ لی جاتی۔ بعض مقامات پر لاش کو دروازے سے نہ لے جایا جاتا بلکہ دیوار میں سوراخ بنا کر اُس میں سے لاش نکالی جاتی اور تیزی سے گھر کے تین چکر لگائے جاتے تاکہ لاش گھر میں داخل ہونے کا راستہ بھول جائے اور دوبارہ کبھی گھر کا چکر نہ لگائے۔

ایسے تجربات نے ابتدائی انسان کو یقین دلا دیا کہ ہر زندہ چیز کی روح یا پوشیدہ زندگی ہوتی ہے جو جسم سے بیماری، نیند یا موت کی صورت میں الگ کی جا سکتی ہے۔ ہندوستان کے قدیم اپنشدوں میں یہ بات لکھی ہے "کسی انسان کو اونچی آواز دے کر نہ جگاؤ کیونکہ اگر روح واپس جسم میں راستہ

نہ پا سکی تو معاملہ مشکل سے حل ہوگا۔ نہ صرف انسان بلکہ تمام چیزوں کی روح ہوتی ہے۔ خارجی دنیا بے حس یا مردہ نہیں تھی یہ بہت زندہ تھی۔ قدیم فلسفے کے مطابق اگر ایسا نہ ہوتا تو فطرت ناقابلِ توجیح واقعات سے پُر ہوتی مثلاً سورج کی حرکت، بجلی کی چمک یا درختوں کی سرگوشیاں، اشیاء اور واقعات کو جاننے کا شخصی طریقہ مجرد یا غیر شخصی طریقے سے پہلے موجود تھا۔ چنانچہ مذہب فلسفے سے پہلے وجود میں آیا۔ ایسی روحیت پرستی مذہب کی شاعری اور شاعری کا مذہب ہے۔ ہم اسے سب سے ادنیٰ درجے ـــــ کی حیران کُن آنکھوں میں دیکھتے ہیں جو اپنے سامنے ہوا میں اُڑتے ہوئے کاغذ کو غور سے دیکھتا ہے اور شاید یقین رکھتا ہے کہ اندر سے کوئی روح کاغذ کو اُڑا رہی ہے۔ یہی احساس ہم اعلیٰ ترین سطح پر شاعر کی زبان میں دیکھتے ہیں۔ غیر متمدن ذہن اور ہر دور کے شاعر کے لئے پہاڑ، دریا، چٹانیں، درخت، ستارے، سورج، چاند اور آسمان مقدس اشیاء ہیں کیونکہ وہ داخلی اور غیر مرئی روحوں کی خارجی اور مرئی نشانیاں ہیں۔ قدیم یونانیوں کے لئے آسمان اور یورنس دیوتا تھا۔ چاند سیلین تھا، زمین گیا تھی، سمندر پوزیڈون اور جنگل پان تھا۔ قدیم جرمنوں کے نزدیک پہلا جنگل جنوں، بھوتوں، دیوؤں، چڑیلوں، بونوں اور پریوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ پرانی مخلوق ویگنر کی موسیقی اور ابسن کے شاعرانہ ڈراموں میں باقی ہے۔ آئرلینڈ کے سادہ کاشتکار اب بھی پریوں پر یقین رکھتے ہیں اور آئرلینڈ کے ادبی احیاء سے متعلق شاعر یا ڈرامہ نگار کو انہیں شاعری اور ڈرامے میں استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اس میں روحیت اور حسن ہے تمام چیزوں کو زندہ محسوس کرنا اچھا ہے، سب سے حساس ہم عصر مصنف حساس روح کے متعلق کہتا ہے،

" فطرت ـــــ خود کو الگ الگ زندہ وجودوں کے انبار کے طور پر

پیش کرنا شروع کرتی ہے۔ کچھ مرئی، کچھ غیر مرئی، لیکن سب اصحابِ روح، اصحابِ جسم اور وجود کے بنیادی راز میں ذہن و جسم کو ملاتے ہوئے ..... دنیا دیوتاؤں سے بھری پڑی ہے! ہر سیارے اور ہر پتھر سے ایک وجود کا صدور ہوتا ہے جو دیوتاؤں جیسی اَن گنت قوتوں سے ہمیں پریشان کر دیتا ہے۔ مضبوط اور کمزور، بڑا اور چھوٹا، اپنے اپنے خفیہ مقاصد کے مطابق آسمانوں اور زمین کے درمیان گردش کر رہا ہے۔" ★

۲۔ مذہب کے مظاہر

چونکہ تمام اشیاء میں روحیں ہیں یا ان میں مخفی دیوتا ہیں چنانچہ مذہبی عبادت کے اَن گنت معروض ہیں۔ ان کی چھ جماعتیں ہیں۔ فلکی، ارضی، جنسی، حیوانی، انسانی اور الہیاتی۔ ہمیں کبھی بھی یہ پتہ نہیں چل سکے گا کہ کائنات کے کون سے معروض کی سب سے پہلے پوجا کی گئی۔ غالباً ان معروضات میں سب سے پہلے چاند کی پوجا کی گئی۔ جس طرح لوک کہانیوں میں "چاند میں انسان" کی بات کی جاتی ہے۔ اسی طرح غیر متمدن داستانوں میں چاند کو ایک ایسا بہادر مرد تصور کیا جاتا جس نے عورت کو ورغلا کر اس کا حیض جاری کیا۔ وہ عورتوں کا محبوب دیوتا تھا جس کی وہ اپنے محافظ دیوتا کی حیثیت سے پوجا کرتیں۔ زرد حلقہ وقت کا پیمانہ تھا، اس کے متعلق عقیدہ تھا کہ یہ موسم کو کنٹرول کرتا، بارش برساتا اور برف باری کرواتا ہے یہاں تک کہ مینڈک بھی اس سے بارش کی دعا کرتے تھے۔

★ جان کوپر پاپاویئز، تہذیب کے ہاتھ ص ۱۸۰

ہم نہیں جانتے کہ قدیم مذہب میں کب سورج نے آسمانوں کے بادشاہ کی حیثیت سے چاند کی جگہ لے لی۔ غالباً یہ اُس وقت ہوا جب کاشت نے شکار کی جگہ لے لی۔ سورج کے سفر نے فصل بیجنے اور کاٹنے کے موسموں کو متعین کیا اور حرارت کو زمین کی زرخیزی کی وجہ تسلیم کیا گیا۔ تب سورج کی شعاعوں سے زرخیز ہونے والی زمین دیوی بن گئی اور انسان نے اس عظیم کرّے کو تمام اشیاء کے باپ کی حیثیت سے پوجنا شروع کر دیا۔ اس سادہ ابتداء سے سورج کی پوجا قدیم انسانوں کے عقائد میں شامل ہوگئی اور بعد کے کئی دیوتا تو محض سورج کی ہی تجسیم تھے۔ یونانی علماء نے انکساگورس کو اس بناء پر وطن بدر کر دیا تھا کہ اُس کے نزدیک سورج دیوتا نہیں بلکہ فقط آگ کا ایک گولا تھا جس کا سائز تقریباً پیلو پونیسس جتنا تھا۔ قرونِ وسطی میں سورج پوجا کی نشانی مونیاء کے سروں پر رکھا نورانی تاج تھا۔ ہمارے اپنے عہد میں جاپان کے بادشاہ کو اُس کی زیادہ تر رعایا سورج دیوتا کی تجسیم سمجھتی ہے۔ شاید ہی کوئی توہم اتنا پرانا ہو لیکن یہ آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ تہذیب اقلیت کی غیر معین محنت اور تعیش ہے جبکہ انسانوں کی اکثریت بڑی مشکل سے ہزارہا سالوں میں تبدیل ہوتی ہے۔

سورج اور چاند کی طرح ہر ستارہ دیوتا تھا اور اپنے اندر مقیم روح کے حکم پر حرکت کرتا تھا۔ عیسائیت کے زیر اثر یہ ارواح رہنما فرشتے بن گئیں اور کیپلر کا ان پہ یقین زیادہ سائنسی سوچ کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ آسمان بذاتِ خود ایک عظیم دیوتا تھا جو بڑی عقیدت کے ساتھ بارش برساتے اور روکنے والے کی حیثیت سے پوجا جاتا تھا۔ بہت ساری قدیم قوموں میں دیوتا لفظ کا مطلب ہی آسمان تھا، لیاری اور ڈنکا میں اس کا مطلب بارش تھا۔ منگولوں کا سب سے بڑا دیوتا ٹینگری ـــــ (آسمان) ـــــ تھا۔ چین میں تائی ـــــ آسمان ـــــ ایرانیوں میں

آ ہو ترا یعنی نیلگوں آسمان، وید ہندوستان میں یہ دیاس پتر یعنی آسمان باپ، یونانیوں میں یہ زیوس یعنی آسمان تھا۔ خود ہمارے یہاں لوگ اب بھی اپنی حفاظت کے لیے "آسمان" (Heaven) سے فریاد کرتے ہیں۔ زیادہ تر قدیم دیومالا کا مرکزی نقطہ زمین اور آسمان کا بار آور ملاپ ہے۔

زمین بھی ایک دیوتا تھا اور اس کے ہر بڑے پہلو کی سرداری کوئی دیوتا کرتا تھا۔ درختوں میں بھی انسانوں کی طرح ارواح تھیں لہذا ان کا کاٹنا سیدھا سادھا قتل تھا۔ بعض اوقات شمالی امریکی انڈین اپنی شکست کا جواز اس طرح پیش کرتے تھے کہ سفید فاموں نے ان درختوں کو کاٹ کر جگہ ہموار کر دی ہے جن کی روحوں نے انہیں تحفظ دیا ہوا تھا۔ مولوکا جزائر میں پھلوں اور پھولوں سے لدے درختوں کو حاملہ سمجھا جاتا، ان کے سکون کو برباد ہونے سے بچانے کے لئے ان کے نزدیک کسی قسم کے شور، آگ یا خلل کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، ورنہ وہ خوف زدہ عورت کی طرح قبل از وقت اپنے پھل گرا دیں گے۔ امبویانا میں چاول کی فصل کے نزدیک شور مچانے نہیں دیا جاتا تھا مبادا فصل مرجھا کر پھونس میں تبدیل ہو جائے۔ قدیم گاؤں بعض مقدس جنگلوں کی پوجا کرتے۔ انگلستان کے ڈریوڈ پادری شاہ بلوط کے درخت کو متبرک سمجھتے جو آج بھی مذہبی رسم کے طور پر رائج ہے۔ درختوں، ندیوں، دریاؤں اور پہاڑوں کی پرستش ایشیاء کے قدیم ترین مذاہب ہیں جن کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ بہت سے پہاڑی مقامات مقدس تھے جو غیر معمولی دیوتاؤں کے مسکن تھے۔ دیوتاؤں کے غصے سے گندھے جھٹکنے پر زلزلے آتے تھے۔ فجیوں کے نزدیک ایسی ہلچل زمین کے دیوتاؤں کی نیند میں کروٹ بدلنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سمواآ زمین کے کانپنے پر جھک جاتے اور دیوتا میفیو سے دعا کرتے کہ وہ رک جائے ایسا نہ ہو کہ وہ سیارے

(زمین) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ تقریباً ہر جگہ زمین کو عظیم ماں سمجھا جاتا ہماری زبان جو اکثر غیر متمدن یا لاشعوری عقائد کی تلچھٹ ہے آج بھی لفظ (Materia) مادہ اور (Mater) ماں کے تعلق کا پتہ دیتی ہے۔ اشتار اور سیبلی، دمیتر اور سیرز افرودتا، وینس اور فرتیا ——— زمین کی دیویوں کی مقابلتاً کم قدیم شکلیں ہیں۔ ان کی زرخیزی، کھیتوں کی فراوانی پیداوار کو متشکل کرتی تھی۔ ان کی پیدائش اور شادی موت اور کامیاب رستخیزی کو افزائش یا گھٹاؤ اور روئیدگی کی فصل تازگی کی علامت سمجھتے تھے۔ یہ دیوتا اپنی جنس کے ذریعے غیر متمدن زراعت اور عورت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب زراعت انسانی زندگی کا غالب طریقہ بن گیا تو روئیدگی کی دیویاں سب سے بڑی فرماں روا ہو گئیں۔ زیادہ تر شروع کے دیوتا صنفِ نازک میں سے تھے بعد میں پدری نظام میں مذکر دیوتاؤں نے ان کی جگہ لے لی۔

جس طرح غیر متمدن ذہن کی اعلیٰ شاعری درخت کی افزائش میں الہیاتی راز کا پتہ دیتی ہے۔ اسی طرح یہ بچے کی پیدائش میں مافوق الفطرت قوت کے عمل کو دیکھتی ہے۔ "وحشی انسان" بیضہ (Ovum) یا نطفہ (Sperm) کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا وہ صرف اس میں شامل خارجی سٹرکچر کو دیکھتا اور انہیں معبود گردانتا تھا۔ اُس کے خیال میں ان میں بھی روحیں ہیں لہٰذا ان کی پوجا کی جانی چاہیئے کیونکہ یہ پُراسرار تخلیقی قوتوں میں سب سے زیادہ تعجب انگیز ہیں۔ کیونکہ ان میں زمین سے بھی زیادہ زرخیزی اور افزائش کا معجزہ رونما ہوتا ہے۔ اس لیئے وہ الہیاتی قوت کا زیادہ بھرپور اظہار ہیں۔ تقریباً تمام قدیم لوگ کسی نہ کسی شکل اور مذہبی رسم کے ذریعے جنس کی پوجا کرتے تھے نہ صرف ادنیٰ درجے کے لوگ بلکہ اعلیٰ درجے کے لوگ بھی اس کی پوجا کے ذریعے اپنی عبادت کا بھرپور اظہار کرتے۔ ہم ایسی عبادت مصر، ہندوستان، بابل، آشور، یونان اور روم میں پائیں گے۔ غیر متمدن

دیوتاؤں کے سیکس کی نوعیت اور وظائف کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا سبب ذہنی فحاشی و عریانی نہیں بلکہ عورت اور زمین کی زرخیزی تھا۔ بعض جانوروں مثلاً گائے اور سانپ کو تولید کی الہیاتی قوت کی علامت کے طور پر پوجا جاتا تھا۔ آدم و حوا کی کہانی میں بے شک سانپ عضو تناسل کی علامت ہے جو جنس کی نمائندگی بدی کے آغاز کے طور سے کرتا ہے، یہ جنسی ظہور کو اچھائی اور برائی کے علم کے طور پر پیش کرتا ہے اور شاید ذہنی معصومیت اور روحانی مسرت میں بالواسطہ کسی روایتی تعلق کا حوالہ دیتا ہے۔

قدیم مصری جواہر (بھونرے کی شکل کا) سے لے کر ہندوؤں کے ہاتھی تک شاید ہی کوئی جانور ہو جس کی کہیں نہ کہیں دیوتا کے طور پر پوجا نہ کی جاتی ہو۔ امریکہ کے انڈین اپنے مخصوص مقدس جانور کو طوطم کا نام دیتے اور جو گروہ اس کی عبادت کرتا اسے اور جرگے کے ہر رکن کو وہی نام دے دیا جاتا۔ یہ مبہم لفظ بشریات میں طوطم مت کے طور پر داخل ہوگیا جو مبہم طریقے سے کسی خاص چیز کی عبادت کی دلالت کرتا جو کسی گروہ کے لئے خاص طور پر مقدس ہوتا یہ زیادہ تر کوئی جانور یا پودا ہوتا تھا۔ طوطم مت کی مختلف شکلیں زمین کے بظاہر بکھرے ہوئے خطوں سے شمالی امریکہ کے انڈین قبائل سے افریقہ کے باشندوں تک، انڈیا کے دراوڑوں اور آسٹریلیا کے قبیلوں میں پائی جاتی ہیں۔ طوطم نے مذہبی معروض کے طور پر قبیلے کو متحد کرنے میں مدد کی، قبیلے کے افراد نے اس کے ذریعے خود کو مربوط سمجھا۔ ایروقیوں نے نیم مذاقیانہ انداز میں یہ سمجھا کہ وہ شروع شروع میں عورت کے ریچھ بھیڑیئے اور ہرن کے ساتھ جنسی عمل کرنے سے وجود میں آئے۔ طوطم ایک معروض یا علامت کے طور پر غیر متمدن لوگوں کے لئے تعلقات اور امتیاز کی مفید نشانی بن گیا، دنیاداری کے معاملات میں یہ نیک شگون یا نمائندہ تصویر بن گیا اور

برادرانہ تعلقات میں شیر، عقاب، بارہ سنگھا اور ہرن نے قوموں کی نمائندگی کی۔ ہاتھیوں کے سے گونگے بے حرکت اڑیل جانور جھگڑالو پن میں ہماری سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کے لئے استعمال ہوتے ہیں، آغاز عیسائیت کی علاقیت میں فاختہ، مچھلی اور بھیڑ طوطم پوجا کی یادگاریں تھیں۔ یہاں تک کہ قبل از تاریخ یہودیوں میں ادنیٰ درجے کا سور بھی ایک طوطم تھا۔ بعض معاملات میں طوطم جانور مانع شے تھا یعنی اسے چھونا منع تھا لیکن مذہبی رسم کی ادائیگی کے طور پر اسے کھایا جاسکتا تھا جس کا مطلب مذہبی طور پر کسی دیوتا کا کھانا تھا۔ حبشہ کے گیلاس بڑی عقیدت کے ساتھ تہوار کے طور پر اُس مچھلی کو کھاتے جس کی وہ پوجا کرتے تھے، ان کا کہنا تھا "جب ہم اسے نگلتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی روح بھی ہمارے اندر حرکت کر رہی ہے"۔ جو مشنری گیلاس کے باشندوں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے وہ ان سادہ لوگوں میں مذہبی رسم کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے جو عیسائیوں کے گرجا میں حضرت عیسیٰ کی بنیادی رسم عشائے ربانی سے بہت ملتی تھی۔

خوف ـــــ جس طرح بہت سارے عقائد کی بنیاد تھا اسی طرح یہ طوطمیت کے آغاز کا سبب تھا۔ انسان جانوروں کی پوجا کرتا تھا کیونکہ جانور طاقتور تھے اور ان کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنا مقصود تھا۔ جب شکار کی بدولت جنگلوں سے درندے کم ہو گئے اور زرعی زندگی نے مقابلتاً محفوظ زندگی فراہم کی تو جانوروں کی پوجا کم ہو گئی اگرچہ یہ مکمل طور پر کبھی بھی ختم نہ ہوئی، غالباً انسانی دیوتاؤں کا ظلم و تشدد جانور دیوتاؤں ہی سے مستعار ہے۔ یہ تغیر تمام زبانوں کے شاعروں کی قلب ہیئت کی کہانیوں میں ملتا ہے جو ہمیں اس امر کا سراغ دیتی ہیں کہ کس طرح دیوتا جانوروں میں تبدیل ہو گئے۔ بعدازاں حیوانی خصوصیات سمجھتے ہے

در آئیں۔ یہاں تک کہ ہومر کے ذہن میں ایک دیوتا کی آنکھیں الو کی اور ایک کی گائے کی تھیں۔ مصر اور بابل کے دیوتاؤں اور دیویوں کا چہرہ انسانی اور جسم درندوں جیسا تھا۔ جس سے اس امر کا اعتراف ہوتا ہے کہ بہت سے انسانی دیوتا کبھی جانور دیوتا تھے۔

تاہم یوں دکھائی دیتا ہے کہ شروع شروع میں زیادہ تر انسانی دیوتا فقط مرے ہوئے تصوراتی انسان تھے۔ خوابوں میں مرے ہوئے لوگوں کا نظر آنا مُردوں کی پوجا شروع کرنے کے لئے کافی تھا۔ کیونکہ عبادت اگر خوف کی اولاد نہیں تو اس کا ہم جنس ضرور ہے۔ وہ انسان جو زندگی میں طاقتور تھے اور لوگ اُن سے ڈرتے تھے مرنے کے بعد پوجے جانے لگے۔ متعدد غیر متمدن قوموں میں لفظ دیوتا کا مطلب "مرا ہوا انسان" تھا حتیٰ کہ آج بھی انگریزی لفظ Spirit اور جرمن Geist سے مراد روح یا بھوت ہے۔ یونانی اپنے مردوں سے اسی طرح دعا مانگتے جس طرح عیسائی اپنے اولیاء سے مانگتے تھے۔ مردہ لوگوں کی حیاتِ مسلسل کے متعلق عقیدہ جو خوابوں کے ذریعے شروع ہوا اتنا مضبوط تھا کہ غیر متمدن انسان انہیں بعض اوقات باقاعدہ پیغامات بھیجتے تھے۔ ایک قبیلے میں اس قسم کے پیغام کی ترسیل کا طریقہ یہ تھا کہ خط کسی غلام کے سامنے پڑھا جاتا پھر خط کی ترسیل کے لئے اس کا سر قلم کر دیا جاتا۔ اگر سردار پیغام کا کوئی حصہ بھول جاتا تو اس حصے کے لئے ایک اور غلام کا سر کاٹا جاتا۔ بھوتوں کی پرستش قدماء کی عبادت بن گیا۔ تمام مردہ لوگوں سے خوف کھایا جاتا اور انہیں راضی کیا جاتا ورنہ وہ لعنت بھیج کر زندہ لوگوں کی زندگی جہنم بنا دیتے۔ یہ اجداد پرستی معاشرتی اختیار اور دوام، قدامت پسندی اور نظم و ضبط کو فروغ دینے کے اس قدر موافق تھی کہ یہ جلد ہی ہر خطۂ زمین پر پھیل گئی۔ یہ مصر، یونان اور روم میں نمو پاتی

رہی اور آج بھی چین اور جاپان میں پوری شدت سے موجود ہے۔ بہت سے لوگ دیوتا کی نہیں بلکہ اپنے پرکھوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ دستور آنے والی نسلوں کی دشمنی کے باوجود خاندان کو متحد رکھتا اور بہت سارے ابتدائی معاشروں کے لئے غیر مرئی سٹرکچر مہیا کرتا۔ جس طرح مجبوری سے ضمیر وجود میں آیا، اسی طرح خوف سے محبت کا ظہور ہوا۔ غالباً خوف ہی کی وجہ سے اجداد پرستی نمودار ہوئی۔ بعد ازاں اس سے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور وہ جو کبھی ظالم دیوتاؤں کے خدوخال رکھتا تھا اپنی ہیئت تبدیل کر کے بہت بڑھتے ہوئے تحفظ، امن اور پجاریوں کے اخلاقی شعور سے آئیڈیل بن گیا۔ تہذیب کی تدریجی ترقی دیوتاؤں کی بعد از وقت دلکشی سے ظاہر ہوتی ہے۔

انسانی دیوتا کا تصور طویل ارتقاء میں جدید قدم ہے۔ یہ کئی مرحلوں کے ذریعے رفتہ رفتہ ارواح اور بھوتوں کے انبوہ عظیم سے ممیز ہوا جو ہر چیز میں رچے بسے تھے۔ مبہم اور بے شکل ارواح کے خوف اور عبادت سے انسان آسمانی، نباتاتی اور جنسی قوتوں کی پرستش کی طرف راغب ہوا۔ اس کے بعد جانوروں کی پوجا اور پھر اجداد پرستی۔ خدا کا تصور بطور باپ غالباً اجداد پرستی ہی سے ماخوذ تھا۔ درحقیقت اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کو جسمانی طور پر دیوتاؤں نے پیدا کیا ہے۔ غیر متمدن الہیات میں دیوتاؤں اور انسانوں میں بہت زیادہ جنسی امتیاز نہیں تھا۔ مثلاً ابتدائی یونانیوں کے لئے آباؤ اجداد دیوتا اور دیوتا آباؤ اجداد تھے۔ مزید ترقی اس وقت ہوئی جب آباؤ اجداد کے انبوہ میں سے خصوصی مردوں اور عورتوں کو چن کر دیوتا بنا دیا گیا۔ چنانچہ بعض اوقات بڑے بڑے بادشاہ موت سے پہلے ہی دیوتا بن گئے۔ لیکن اس ارتقاء کے ساتھ ہم تاریخی تہذیب تک پہنچتے ہیں۔

۳۔ مذہب کے طریقہ ہائے کار

دنیا نے ارواح کا تصور کر کے جس کی نوعیت اور ماہیت سے غیر متمدن انسان ناواقف تھا۔ اس نے انہیں راضی کرنے اور ان سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ارواحیت کی ابتداء ہوئی جو غیر متمدن مذہب کی روح تھی۔ اس کے ساتھ جادو کا اضافہ کیا گیا جو غیر متمدن مذہبی رسموں کی جان تھا۔ پولی نیسن جادو کی بے پناہ قوت کو تسلیم کرتے تھے۔ جسے وہ مانا (Mana) کہتے تھے ان کا خیال تھا کہ جادوگر اس لامتناہی رسد مین سے رس نکالتا ہے۔ جن طریقوں سے روحیں اور بعد ازاں دیوتا انسانی مقاصد سے حلف دروغی کرتے تھے اس کا زیادہ تر حصہ "ہمدردانہ جادو" تھا۔ لوگ مطلوبہ کام کے لئے اُسی کام کو جزوی طور پر کر کے دیوتاؤں سے مدد طلب کرتے۔ بارش کروانے کے لئے غیر متمدن دور کے جادوگر درختوں سے پانی گراتے۔ قحط سے خوف زدہ کافر کسی مشنری سے کہتے کہ کھلی چھتری کے ساتھ کھیتوں میں جائے۔ سُماترا میں بانجھ عورت بچے کا پُتلا بنا کر اُسے گود میں لیتی اس طرح اُسے اُمید ہوتی کہ وہ حاملہ ہو جائے گی۔ بابر آر کی پیلیگو میں ہونے والی ماں سُرخ کپڑے سے گڑیا بناتی اُسے دودھ پلانے کا عمل کرتی اور جادو کا فارمولہ دہراتی اس کے بعد وہ پورے گاؤں میں مشہور کر دیتی کہ وہ حاملہ ہے اس کی ساتھی اُسے مبارکباد دینے آتیں۔ فقط کوئی سرکش حقیقت ہی اس تخیل پر رشک کرنے سے انکار کر سکتی تھی۔ بورنیو کے ڈیاکوں میں عورت کے دردِ زہ کم کرنے کے لئے جادوگر بچے کی پیدائش کے درد سے خود گزرتا۔ یہ جادو ہونے والے بچے کو پیدا ہونے کی ترغیب دیتا۔ بعض اوقات جادوگر اپنے پیٹ سے آہستہ آہستہ ایک پتھر نیچے گراتا اس سے یہ اُمید ہوتی کہ بچہ اُس کی نقل کرے

گا اور جلد باہر آجائے گا۔ قرونِ وسطیٰ میں کسی شخص کی موم کی مورتی میں سوئیاں چبھو کر اُس پر جادو کیا جاتا۔ پیرو وین انڈین لوگوں کے پتلے بنا کر جلاتے اور اسے روح کا جلنا قرار دیتے۔ حتیٰ کہ جدید لوگ بھی اس غیر متمدن جادو سے بالا نہیں ہیں۔

ابہام کے یہ طریقے بالخصوص زمین کی زرخیزی کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ ندلو کے طبیب ایسے نوجوان کے اعضائے تناسل کو بھون کر اس کا سفوف بناتے جو جوانی میں مر جاتا اور اُسے کھیتوں میں چھڑک دیتے۔ بعض قومیں کسی بادشاہ اور ملکہ یا دولہا اور دلہن کا انتخاب کرتے اور سرِعام ان کی شادی کرتے تاکہ زمین توجہ کرے اور زیادہ پیداوار دے۔ بعض علاقوں میں اس رسم میں سرِعام شادی کے مقصد کی تکمیل ہوتی تاکہ فطرت، اگر سرد مہر بھی ہے تو اسے اپنا فرض سرانجام دینے میں کسی غلط فہمی کا بہانہ نہیں ملنا چاہیئے۔ جاوا میں کاشتکار اور ان کی بیویاں چاول کی فصل کی بہتات کو یقینی بنانے کے لئے کھیتوں میں مباشرت کرتے۔ کیونکہ غیر متمدن انسان زمین کی افزائش کے متعلق نائٹروجن کے حوالے سے نہیں جانتا تھا وہ بظاہر پودوں میں جنسی عمل کو جانے بغیر اس طرح سوچتا جس طرح عورت کی بارآوری کے متعلق سوچتا تھا۔ ہماری اپنی اصطلاحات ان کے شاعرانہ عقیدے کی یاد دلاتی ہیں۔

تقریباً ہر طرف بیجائی کے موسم میں آزاد مباشرت کے میلے لگتے جن کا مقصد جزوی طور پر اخلاقی ضابطوں کو وقتی طور پر ختم کر دینا تھا (قدیم دنوں کی جنسی آزادی کی یاد دلاتے ہوئے) اور جزوی طور پر نامرد مردوں کی بیویوں کو زرخیز کرنا تھا اور جزوی طور پر اس کا مقصد بہار میں زمین سے یہ گوش گزاری تھی کہ سردیوں کی احتیاط کو ختم کر دے۔ پیش کردہ بیج کو قبول کرے اور بہت

زیادہ غذا دینے کے لئے خود کو تیار کرے۔ ایسے شواہد بہت ساری فطری قوموں میں پائے جاتے تھے لیکن خصوصاً کانگو کے کیمرون، کافروں، ہوٹنٹاٹوں اور بانٹوں میں پائے جاتے تھے۔ بانٹس کا ریورینڈ ایچ راؤلے کہتا ہے:۔

"ان کی فصلوں کے تہوار اپنی نوعیت کے اعتبار سے بکیس کی ضیافتوں کی طرح ہیں۔ انہیں شرم محسوس کئے بغیر دیکھنا ناممکن ہے۔۔۔۔ نہ صرف یہ کہ نوآموزوں کو جنسی اجازت دی جاتی ہے بلکہ بعض معاملات میں اسے لازمی قرار دیا جاتا ہے، کسی اجنبی کی جو تہوار میں آگیا ہو اس فحاشی میں شامل ہونے کے لئے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ آزاد مباشرت ہوتی ہے اور اردگرد کے ماحول کی وجہ سے زناکاری کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ جو شخص تہوار میں شامل ہوتا ہے اُسے اپنی بیوی کے ساتھ جنسی عمل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

تاریخی تہذیب میں بھی ایسے ہی تہوار نظر آتے ہیں۔ یونانیوں کے بکیس کے تہوار، روم کا سیٹرنیلیا کا تہوار، قدیم فرانس کا فیتے دیس فاؤں کا تہوار، انگلستان کا یوم مئی کا تہوار اور ہم عصر عہد میں کارنیوال یا ماردی گراس کا تہوار۔

اِدھر اُدھر مثلاً پاینس اور گویا کویل انڈینز میں روئیدگی کی رسوم کم پرکشش شکل میں ہوتی تھیں۔ پہلے پہل انسان اور بعد میں جانور کو بیجائی کے وقت قربان کیا جاتا تاکہ اُس کے خون کے ذریعے اسے زرخیز کیا جا سکے۔ جب فصل کاٹنے کا موسم آتا تو اسے مردہ آدمی کا یوم نجات سمجھا جاتا۔ موت سے پہلے اور بعد میں مردے کو دیوتا کی طرح محترم سمجھا جاتا۔ اس بنیاد پر ہزاروں شکلوں میں آفاقی دیومالا پیدا ہوئی جس میں دیوتا اپنے لوگوں کے لئے مرتا اور پھر کامیاب ہو کر زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ شاعری نے جادو کی تزئین کی اور اسے الہیات

میں بدل دیا۔ آسمانی دیومالا روشیدگی کی رسم کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی۔ مرنے اور دوبارہ زندہ ہونے والے دیوتا کی دیومالا کا اطلاق نہ صرف سردیوں کی موت اور بہار کی حیات نو پر ہونے لگا بلکہ خزاں اور بہار کے سنجوگ پر بھی اور دن کے زرد پڑنے اور بڑھنے پر بھی۔ رات کا آنا اس المیہ ڈرامے کا حصہ تھا۔ ہر روز سورج دیوتا طلوع ہوتا اور غروب ہو جاتا۔ ہر روز سورج کا غروب ہونا اس کی موت اور طلوع ہونا اس کی حیات تھی۔

انسانی قربانی جس کی بہت سی اشکال تھیں کسی نہ کسی عہد میں ہر قبیلے میں احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ خلیج میکسیکو میں کیروکینا کے جزیرے پر ایک بوڑھے میکسیکو دیوتا کا خستہ دھات کا مجسمہ ملا ہے اس میں انسانی وجود کی باقیات ہیں جسے بظاہر دیوتا کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے جلایا گیا تھا۔ ہر کوئی مورخ کے متعلق جانتا ہے جیسے فونیشین، کارتھیجین اور بعض اوقات دوسرے سامی انسان قربانیاں پیش کرتے تھے۔ ہمارے اپنے وقتوں میں رہوڈیشیا میں یہ رسم موجود ہے۔ غالباً اس کا تعلق آدم خوری سے تھا۔ انسان کا خیال رہا ہوگا کہ دیوتاؤں کے ذائقے بھی ان کی طرح تھے۔ چونکہ مذہبی عقائد دیگر عقیدوں کی نسبت آہستہ بدلتے ہیں اور رسوم عقائد کی نسبت زیادہ سست روی سے تبدیل ہوتی ہیں، چنانچہ انسانی آدم خوری کے بعد بھی یہ الہیاتی آدم خوری جاری رہی۔ تاہم اخلاقی ضابطوں کے بتدریج ارتقاء کے ساتھ مذہبی رسوم بھی بدل گئیں۔ دیوتاؤں نے اپنے پجاریوں کی بڑھتی ہوئی شرافت کی نقل کی اور انسانی گوشت کی بجائے جانوروں کے گوشت پر اکتفا کیا۔ ہرنی نے افیجنیا کی جگہ لے لی اور دنبے نے ابراہیم کے بیٹے کی۔ بعض اوقات تو دیوتاؤں کو جانور کا گوشت بھی نہ ملتا۔ پادری ذائقہ دار غذا پسند کرتے۔ قربانی کے قابلِ خورد حصے خود کھا جاتے

اور صرف انتڑیاں اور ہڈیاں بھینٹ چڑھاتے تھے۔

چونکہ قدیم انسان کا یقین تھا کہ جو کچھ وہ کھاتا ہے اس کی قوت حاصل کر لیتا ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی سی قوت حاصل کرنے کے لئے وہ دیوتا کو کھانے کے تصور تک جا پہنچا۔ بہت سے واقعات ایسے ہیں کہ اس نے انسان دیوتا کا گوشت کھایا اور اس کا خون پیا جسے اس نے دیوتا بنایا اور قربانی کے لئے خوب موٹا کیا تھا۔ خوراک کی رسد کے تسلسل سے وہ زیادہ اچھا انسان بن گیا۔ قربانی کی شے کو بدل دیا اور اسے کھانے تک اکتفا کیا۔ قدیم میکسیکو میں غلے، بیج اور سبزی سے دیوتا کی شبیہہ بنائی جاتی اور اس مقصد کے لئے جن لڑکوں کو قربان کیا جاتا۔ ان کا خون اس پر مَل دیا جاتا اور پھر دیوتا کو کھانے کی مذہبی رسم کے طور پر انہیں کھایا جاتا۔ ایسی رسمیں کئی غیر متمدن قبائل میں دیکھی گئی ہیں۔ اکثر شرکت کرنے والوں کو مقدس شے کھانے سے پہلے روزہ رکھنا پڑتا تھا اور پادری جادو کے فارمولوں سے اس شے کو دیوتا میں تبدیل کر دیتا۔

جادو کا آغاز توہم سے ہوا اور اس کا اختتام سائنس پر ہوا۔ جادو کے عقائد کا بے پایاں سلسلہ ارواحیت سے شروع ہوا اور کئی عجیب و غریب فارمولوں اور رسموں میں منتج ہوا۔ کوکو اس بات سے اپنی ہمت بندھائے کہ جتنے دشمنوں کو قتل کر دیں گے۔ وہ اگلی زندگی میں غلام بن کر ان کی خدمت کریں گے۔ اس کے برعکس ایک بانٹو اپنے دشمن کو قتل کر کے اپنا سر منڈوا لیتا اور بکری کے فضلے کو سر پر مَل لیتا تاکہ مرے ہوئے شخص کی روح واپس آکر ستانے سے روکا جا سکے۔ تقریباً تمام غیر متمدن قومیں بد دعاؤں کی قبولیت اور بد نظر کی تباہی پر یقین رکھتی تھیں۔ آسٹریلوی باشندوں کو یقین تھا کہ ایک بڑے جادوگر کی لعنت سینکڑوں میل پر سے انسان کو مار سکتی ہے۔ جادوگری پر

یقین انسانی تاریخ میں اوائل ہی سے شروع ہوا اور کبھی ختم نہیں ہوا۔ ایسے بتوں یا چیزوں کی پوجا جن میں جادوئی قوت ہو اب بھی موجود ہے۔ چونکہ بہت سارے جنتر منتر اور تعویذ ایک خاص قوت تک محدود کر دیئے جاتے ہیں، اس لئے بعض لوگوں کے پاس ان کی مختلف قسموں کا انبار ہوتا ہے تاکہ وہ ہر وقت تیار ہوں اور کسی بھی ضرورت کے وقت کام آسکیں۔ تبرک ان اشیاء کی ایک جدید مثال ہے جن میں جادوئی قوت ہوتی ہے۔ یورپ کی آدھی آبادی کوئی ایسا تعویذ یا لکٹ پہنتی ہے جو انہیں مافوق الفطرت تحفظ مہیا کرتی ہے۔ تمدن کی تاریخ ہر قدم پر ہمیں بتاتی ہے کہ تہذیب کا سرکچہ کتنا کمزور اور سطحی ہے اور کس طرح خوفناک طریقے سے بربریت، توہم اور جہالت کے آتش فشاں کے دہانے پر ایستادہ ہے۔ جدیدیت ایک ایسی ٹوپی ہے جو قرونِ وسطیٰ پر منڈھ دی گئی ہے اور جو ہمیشہ قائم رہے گی۔

فلسفی اس انسانی مافوق الفطرت ضرورت اور سہولت کو بڑی شان سے قبول کرتا ہے اور یہ کہہ کر اپنی تسلی کر لیتا ہے کہ جس طرح ارواحیت سے شاعری نے جنم لیا۔ اسی طرح جادو سے ڈرامہ اور سائنس پیدا ہوئی۔ فریزر نے ایک اعلیٰ جدت پسند کی فطری مبالغہ آرائی کے ساتھ کہا ہے کہ سائنس کی عظمتوں کی جڑیں جادو کی حماقتوں میں پیوستہ ہیں۔ چونکہ اکثر جادو ناکام ہو جاتا۔ چنانچہ جادوگر کے لئے مفید تھا کہ قدرتی عمل کی دریافت کرے جس کے ذریعے وہ مافوق الفطرت قوتوں کی مدد کر سکتا تھا تاکہ مطلوبہ واقعہ عمل میں لایا جاسکے۔ بتدریج قدرتی ذرائع غالب آگئے۔ اگرچہ جادوگر نے لوگوں میں اپنی اہمیت محفوظ رکھنے کے لئے ان قدرتی ذرائع کو چھپائے رکھا اور اس کا کریڈٹ مافوق الفطرت جادو کو دیا۔ بالکل اسی طرح ہمارے عہد کے لوگ فطرتی علاج کو جادوگری

کے نسخوں کا کریڈٹ دیتے ہیں۔ اس طرح جادو نے طبیب، کیمیا دان، دھات کار اور ہیئت دان کو جنم دیا۔

جادو نے سب سے پہلے پادری کو پیدا کیا۔ جس طرح مذہبی رسومات زیادہ تعداد میں اور پیچیدہ ہوتی گئیں وہ عام آدمی کے علم اور اہلیت سے بڑھ گئیں۔ چنانچہ ایک خاص طبقہ پیدا ہوا جس نے اپنا زیادہ وقت مذہبی وظائف اور رسومات کے لئے وقف کیا۔ پادری بطور جادوگر سحر یا دعا کے ذریعے روحوں اور دیوتاؤں کے ارادے تک رسائی رکھتا تھا اور انسانی مقاصد کو بدل سکتا تھا۔ چونکہ ایسا علم اور فن غیر متمدن انسان کو بہت قابلِ قدر لگتا تھا اور ہر قدم پر مافوق الفطرت قوتیں انسانی قسمت پر اثر ڈالتی تھیں چنانچہ پادری کی طاقت ریاست کی طرح بڑھ گئی۔ نسبتاً جدید معاشروں سے عہدِ حاضر تک پادری انسانوں پر قابو پانے اور منظم بنانے میں جنگجوؤں کا بدل ثابت ہوا ہے۔ مصر، جوڈیا اور قرونِ وسطیٰ کا یورپ اس کی مثالیں ہیں۔

پادری نے مذہب کو تخلیق نہیں کیا بلکہ اس نے اسے استعمال کیا ہے جس طرح ایک سیاست دان انسانوں کے نفسیاتی ہیجانات اور رسوم کو استعمال کرتا ہے۔ مذہب مشائخانہ ایجاد یا ہیر پھیر سے پیدا نہیں ہوا بلکہ انسان کی مسلسل حیرانی، خوف، عدم تحفظ، ناامیدی اور تنہائی سے پیدا ہوا۔ پروہت اوہام کو سہارا دے کر اور علم کی بعض شکلوں پر اجارہ داری قائم کر کے نقصان دہ ثابت ہوا لیکن اس نے اوہام کو محدود بھی کیا اور بعض اوقات اس کی حوصلہ شکنی بھی کی۔ اس نے لوگوں کو ابتدائی تعلیم دی اور نسلِ انسانی کی پیش پا ثقافتی وراثت کے مخزن اور وسیلے کا کام دیا۔ اس نے طاقتور کے ہاتھوں کمزور کے استحصال پر اس کو تسلی دی۔ اس کے ذریعے مذہب میں آرٹ پیدا ہوا اور

انسانی اخلاقیات کے نازک سٹرکچر کی مافوق الفطرت حوالوں سے ترویج ہوئی۔ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو لوگوں نے اُسے ایجاد کر لیا ہوتا۔

۴۔ مذہب کا اخلاقی وظیفہ

مذہب دو بڑے ذرائع ـــــ دیو مالا اور امتناع ـــــ سے اخلاقیات کا مددگار رہے۔ دیو مالا مافوق الفطرتی عقیدہ پیدا کرتی ہے جس کے ذریعے اس اخلاق کو آسمانی جواز ملتا ہے جو معاشرتی (یا پروہتائی) طور پر پسندیدہ ہوتا ہے۔ آسمانی امیدیں اور خوف فرد میں ان پابندیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں جو اس کے مالک اور گروہ کی طرف سے اُس پر عائد کی جاتی ہیں۔ انسان فطری طور پر فرماں بردار، شریف یا نیک نہیں ہے اور ضمیر کی قدیم مجبوری کے بعد اگر کوئی چیز اسے اس طرح غیر محسوس اور تسلسل کے ساتھ ان ناموافق اچھائیوں کی طرف مائل کرتی ہے تو وہ دیوتاؤں کا خوف ہے۔ ملکیت اور شادی کے دستور کسی حد تک مذہبی منظوری پر منحصر ہوتے ہیں اور بے عقیدہ زمانوں میں اپنی شدت کھو بیٹھتے ہیں۔ حکومت ـــــ جو بذاتِ خود ایک غیر فطری اور لازمی معاشرتی میکانزم ہے، اکثر پروہت کی مدد حاصل کرتی ہے۔ اس بات کو نپولین اور مسولینی جیسے چالاک ملحدوں نے فوراً دریافت کر لیا تھا۔ "حکومتِ الٰہیہ کا میلان اپنی سرشت کے اعتبار سے اتفاقی ہے۔" غیر متمدن سردار کی طاقت جادو اور افسوں گری سے بڑھ جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ہماری اپنی حکومت ہر سال زائرین کے خدا سے شرف حاصل کرتی ہے۔

پولینیشیا کے باشندوں نے مذہب کی امتناعات کو Tabu کا لفظ دیا۔ زیادہ ترقی یافتہ قدیم معاشروں میں یہ امتناعات وہ مقام حاصل کر گئے کہ تمدن کے

ماتحت قوانین بن گئے۔ یہ اکثر منفی صورت میں ہوتے تھے۔ بعض کاموں یا اشیاء کو "مقدس" یا "ناپاک" قرار دیا جاتا تھا۔ ان دونوں لفظوں کا اصل مفہوم ایک انتہا تھا۔ اسے چھوا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ کو وینینٹ کی کشتی نوح ایک امتناع تھی، اور ازہ کو اسے چھونے پر مار دیا گیا تھا کہ یہ گر نہ پڑے۔ دایو دورس ہمیں بتاتا ہے کہ قدیم مصری قحط کے دنوں میں قبیلے کے طوطم جانور کو کھانے سے امتناع کی خلاف ورزی نہ کرتے جبکہ باری باری ایک دوسرے کو کھا جاتے۔ زیادہ تر غیر متمدن معاشروں میں ان گنت چیزیں ممنوع تھیں۔ بعض الفاظ اور اسماء کبھی نہیں پکارے جاتے تھے اور بعض دن اور موسم امتناع میں آتے تھے ایسے وقت کام کرنا منع تھا۔ غذا کے معاملے میں غیر متمدن انسان کا سارا علم اور کچھ جہالت غذائی امتناع میں اظہار پاتی۔ علم حفظان صحت کی تاکید سائنس یا ادویات نے نہیں مذہب نے کی ہے۔

عورت —— غیر متمدن امتناع کا پسندیدہ مظہر تھی۔ ہزاروں اوہام اُسے اُچھوت، ضرر رساں اور ناپاک بناتے رہے۔ دنیا کی دیو مالا کو تشکیل دینے والے ناکام خاوند تھے کیونکہ وہ عورت کو تمام برائیوں کی جڑ ماننے پر متفق تھے۔ یہ تصور نہ صرف عبرانی اور عیسائی روایت میں مقدس تھا بلکہ سینکڑوں دیگر بُت پرست دیو مالاؤں میں بھی مقدس تھا۔ حیض والی عورت پر سخت ترین غیر متمدن امتناع لگائے جاتے تھے۔ کوئی انسان یا شے اگر ان دنوں میں اسے چھوتی نیکی یا سودمندی کھو دیتی۔ انگریز گیانا کے میکوسی عورتوں کو حیض کے دنوں میں نہانے سے منع کرتے تھے کہ اس حالت میں وہ پانی کو زہر آلودہ کر دیں گی۔ اسی طرح وہ جنگلوں میں نہیں جا سکتی تھیں کہ مسحور سانپ انہیں ڈس لیں گے۔ یہاں تک کہ بچے کی پیدائش ناپاک تھی۔ اس کے بعد عورت اپنے آپ کو سخت جان مذہبی

رسموں سے پاک کرتی تھی۔ عورتوں کے نہ صرف حیض کے دنوں میں بلکہ بچے کو دودھ پلانے کے دنوں میں بھی جنسی تعلقات ممنوع تھے۔ بعض اوقات یہ ممانعتیں عورتوں نے خود شروع کی تھیں۔ یہ ان کے اپنے تحفظ اور سہولت کے لئے تھیں۔ لیکن ابتداء کو آسانی سے بھلا دیا جاتا ہے اور جلد ہی عورت نے خود کو "ناپاک" اور "پلید" سمجھا۔ بالآخر اس نے مرد کے نقطۂ نگاہ کو قبول کر لیا اور حیض اور حمل کے دنوں میں شرم محسوس کرنے لگی۔ ان امتناعات سے جزوی طور پر حیاء احساسِ گناہ، سیکس کے متعلق ناپاکی کا تصور، تیاگ، پروہتائی تجرد اور عورت کی محکومیت نے جنم لیا۔

مذہب اخلاقیات کی بنیاد نہیں بلکہ اس کا معاون ہے۔ اخلاق مذہب کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اور اکثر اس کی عدم تعلقی یا سخت گیر مزاحمت کے باوجود اخلاق نے ترقی کی ہے۔ بالکل ابتدائی اور بعض نسبتاً بعد کے معاشروں میں اخلاقیات مذہب سے آزاد نظر آتی ہے۔ مذہب کا تعلق کردار کی اخلاقیات سے نہیں بلکہ جادو، رسوم، قربانی سے تھا۔ اچھے انسان کو رسوم ادا کرنے اور ان پر رقم خرچ کرنے سے ممیز کیا جاتا ہے۔ اصولاً مذہب کسی خیرِ مطلق (چونکہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں) کی منظوری نہیں دیتا بلکہ کردار کے ان معیارات کی منظوری دیتا ہے۔ جو معاشی اور معاشرتی حالات کے بل بوتے پر قائم ہوتے ہیں۔ قانون کی طرح یہ ماضی میں اپنے فیصلوں کو دیکھتا ہے اور جب حالات کے بدلنے کے ساتھ اخلاقیات میں تبدیلی آتی ہے تو مذہب پیچھے رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یونانی محرمات کے ساتھ مباشرت سے نفرت کرتے تھے۔ جبکہ ان کی دیو مالا اس کے حامل دیوتاؤں کی تکریم کرتی تھی عیسائی یک زوجی پر عمل کرتے جبکہ ان کی بائیبل نے کثیر الزوجیت کو قانونی بنا دیا۔ غلامی کو ختم کر دیا گیا جبکہ پادریوں نے بائیبل کی سند پر اسے مقدس ٹھہرایا۔ ہمارے

اپنے عہد میں چرچ ایسے اخلاقی ضابطے کے حق میں لڑتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ صنعتی انقلاب بظاہر مر چکا ہے۔ بالآخر زمینی قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ اخلاقیات بتدریج معاشی ایجاد سے موافقت پیدا کرتی ہے اور مذہب با دلِ نخواستہ اخلاقی تبدیلی سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ مذہب کا اخلاقی وظیفہ نئی اقدار پیدا کرنا نہیں، بلکہ قائم شدہ اقدار کو محفوظ رکھنا ہے۔

چنانچہ مذہب اور معاشرے میں تناؤ ہر تہذیب کے اعلیٰ مدارج کی نشاندہی کرتا ہے۔ خوف زدہ اور حواس باختہ انسان کو سحرانہ امانت کی پیشکش سے مذہب کا آغاز ہوتا ہے اور کسی قوم کو اخلاق اور عقائد کی وحدت دینے میں مختتم ہوتا ہے جو سیاست دانوں اور آرٹ کو بہت بھاتا ہے۔ یہ ماضی کی مردہ لاش کو زندگی دینے کی کوشش میں خودکشی کر لیتا ہے۔ جوں جوں علم بڑھتا یا بدلتا ہے یہ دیو مالا اور الٰہیات سے ٹکراتا ہے۔ فنون اور علوم کا پروہتائی کنٹرول اذیت ناک سلاسل یا نفرت انگیز رکاوٹ محسوس ہوتا ہے اور ذہنی و عقلی تاریخ سائنس اور مذہب کے درمیان تحاریب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔
جو ادارے پہلے پادری طبقوں کے ہاتھ میں تھے مثلاً "قانون، سزا، تعلیم اور اخلاقیات، شادی اور طلاق، وہ ادارے خدام الدین کے ہاتھوں سے نکل کر سیکولر اور دنیوی ہو جاتے ہیں۔ دانشور طبقہ قدیم الٰہیات اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے متعلقہ اخلاقی ضابطے کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔ ادب اور فلسفہ پادری دشمن ہو جاتا ہے۔ آزادی کی تحریک عقل و دلیل کی پرستش تک جا پہنچتی ہے اور پُر تیقن اور تصور کے متعلق مفلوج کر دینے والے ازالۂ سحر کا شکار ہو جاتی ہے۔
مذہبی سہاروں سے محروم چال چلن عیاشانہ انتشار میں ڈھل جاتا ہے۔ عقیدے کے بغیر زندگی شعوری افلاس اور واماندہ امارت دونوں کے لئے بوجھ بن جاتی

ہے۔ بالآخر معاشرہ اور اس کا مذہب دونوں زوال کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے جسم اور روح ایک طرح کی موت مرتے ہیں۔ اسی طرح مظلوموں میں ایک اور دیو مالا جنم لیتی ہے جو انسانی امیدوں کو نئی شکل اور انسانی کاوش کو نیا ولولہ دیتی ہے اور صدیوں کے انتشار کے بعد نئی تہذیب کی تعمیر کرتی ہے۔

نواں باب

تہذیب کے ذہنی عوامل

۱۔ تحریر

ابتداء میں لفظ ہی نے انسان کو انسان بنایا۔ ان عجیب و غریب آوازوں کے بغیر جنہیں اسمائے نکرہ کہا جاتا ہے۔ سوچ الگ تھلگ اشیاء یا حسی، بالخصوص بصری تجربات تک محدود تھی۔ کلیات کو اجزاء سے الگ کر کے اور اشیاء کو ان کے خواص سے ممیز کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جنس (Class) کی نمائندگی کرنے والے الفاظ کے بغیر کسی خاص انسان کے متعلق سوچا جا سکتا ہے لیکن انسان بطورِ جنس (CLASS) نہیں سوچا جا سکتا۔ کیونکہ آنکھیں مادی انسان کو دیکھتی ہیں۔ انسان کے مجرد تصور، انسان، کو نہیں دیکھتیں۔ انسانیت کی شروعات اس وقت ہوئی جب کچھ جانور اور کچھ آدمی نما انسان نے غار یا درخت پر پالتی مار کر اپنے دماغ کو پہلے اسم نکرہ ایجاد کرنے میں معروف کیا۔ پہلی آواز جو ایک جیسی اشیاء کے گروپ کی نشاندہی کرے گی ' گھر' جس کا مطلب تمام گھر ہوں 'انسان' جس سے مراد تمام انسان ہوں اور روشنی کا مطلب ہر وہ روشنی جو زمین یا سمندر پر چمکی ہو۔ اس لمحے سے انسان نے ایک نئے اور نا مختتم ذہنی سفر کا آغاز کیا۔ لفظ سوچ کے لئے اسی طرح کام آتے ہیں جس طرح کام کے لئے اوزار۔ پیداوار زیادہ تر اوزار

کی ترقی پر منحصر ہے۔

چونکہ آغاز میں سب کچھ اندازے ہی تھے۔ لہذا گفتار کے آغاز کی تصویر کشی میں متخیلہ بالکل آزاد رہی۔ شاید زبان کی پہلی شکل — جیسے اشاروں کے ذریعے ابلاغ کہا جاسکتا ہے — ایک جانور کا دوسرے جانور کو محبت کا بلاوا تھا۔ اس اعتبار سے جنگل، جھاڑیاں اور مرغزار گفتار کے ساتھ زندہ ہیں۔ ایک دوسرے کو خبردار کرنے اور دہشت میں نکالی جانے والی آوازیں ماں کی بچے کو آواز، جنونی کی آوازیں اور پیدائش کی خوشی کا اظہار، ایک درخت سے دوسرے درخت تک چہچہاہٹ، سب جانوروں کی طرف سے انسان کی گفتار کی تیاریاں تھیں۔

شیلون فرانس کے نزدیک جنگل میں رہنے والی ایک لڑکی خوفناک چیخوں اور غراہٹوں کے علاوہ کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ جنگل کی یہ زندہ آوازیں ہمارے کانوں کو بے معنی لگتی ہیں۔ ہم فلسفیانہ مزاج کے مالک کتے رکی کی طرح ہیں جو اپنے مالک کے متعلق کہتا ہے "میری آواز سے جو کچھ اظہار پاتا ہے اس کا کچھ مطلب ہوتا ہے جبکہ میرے مالک کے منہ سے زیادہ بکواس نکلتی ہے"۔ وٹ مین اور کریگ نے کبوتروں کی حرکات اور شوروغل کے درمیان عجیب تلازم دریافت کیا ہے۔ ڈویون نے پکھیرو اور فاختہ کی استعمال کردہ بارہ مخصوص آوازوں، کتے کی پندرہ اور سینگوں والے مویشیوں کی بائیس آوازوں کو ممیز کیا ہے۔ گارنر کو معلوم ہوا کہ بوزنے بیس مختلف آوازوں اور بے شمار جسمانی حرکات سے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہیں۔ اس معمولی ذخیرۂ الفاظ سے ہم چند قدم آگے چلتے ہیں تو ایک سادہ آدمی اپنی روزمرہ گفتگو میں تین سو لفظ استعمال کرتا نظر آتا ہے۔

ابتدائی سوچ کے ابلاغ میں حرکت و جنبش بنیادی جبکہ گفتار ثانوی درجے پر نظر آتی ہے۔ جب گفتگو سے کام نہیں چلتا پھر اشاروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ شمالی امریکی انڈین کی بے شمار زبانیں تھیں، اکثر شادی شدہ جوڑے دو مختلف قبیلوں سے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کے درمیان ابلاغ گفتار کی بجائے اشاروں سے ہوتا تھا۔ لیوس مارگن ایک ایسے جوڑے سے واقف تھا جو تین سال تک ابلاغ کے لئے اشارے ہی استعمال کرتا رہا۔ بعض ہندوستانی زبانوں میں حرکات و اشاروں کی اتنی اہمیت تھی کہ اہر پاؤ اندھیرے میں ابلاغ نہیں کر سکتے تھے۔ غالباً پہلے لسانی الفاظ حروفِ استعجابیہ تھے ـــ جانوروں کی طرح جذبے کا اظہار، پھر اسماء جن کے ساتھ سمت کی طرف اشارے بھی شامل تھے۔ پھر تقلیدی آوازیں جو وقت کے ساتھ اشیاء یا افعال کا نام بن گئیں۔ ہزاروں سال کی غیر یقینی لسانی تبدیلیوں اور پیچیدگیوں کے بعد ہر زبان میں ابھی تک سینکڑوں تقلیدی الفاظ موجود ہیں۔ قدیم برازیل کا ٹیکونا قبیلے کا چھینک کے لئے مکمل تقلیدی لفظ موجود تھا ـــ Haitschu ـــ غالباً اسی طرح کے آغاز سے ہر زبان کے بنیادی الفاظ وجود میں آئے۔ ایناں نے تمام عبرانی الفاظ کو پانچ سو مبادی الفاظ اور سکیٹ نے تمام یورپی الفاظ کو چار سو مبادی الفاظ تک گھٹا دیا ہے۔

سادگی کے اعتبار سے فطری قوموں کی زبانیں لازمی طور پر غیر متمدن نہیں ہیں۔ ان میں سے کئی ذخیرۂ الفاظ اور سٹرکچر کے اعتبار سے سادہ ہیں لیکن بعض ہماری زبانوں کی طرح کمپلیکس اور چینی زبان سے زیادہ منظم ہیں۔ ان میں لفاظی بھی شامل ہے۔ تقریباً تمام غیر متمدن زبانیں خود کو جزئیات اور حسیات تک محدود رکھتی تھیں، جبکہ کلی یا مجرد اعتبار سے ناکافی تھیں۔ آسٹریلیا کے باشندے کتے کی

دُم اور گائے کی دُم کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن ان کی زبان میں دُم کے لئے کوئی لفظ نہیں تھا۔ تسمانین کے خاص خاص درختوں کے الگ الگ نام تھے لیکن درخت کے لئے کوئی عمومی لفظ نہیں تھا، چوکٹا انڈین سیاہ شاہ بلوط، سفید اور سرخ شاہ بلوط کے لئے الگ الگ نام لیتے تھے لیکن شاہ بلوط کے لئے کوئی نام نہیں تھا۔ درخت کے لئے تو کیا ہوتا۔ بلاشبہ کئی نسلوں کے بعد اسم معرفہ اسم نکرہ میں تبدیل ہوا۔ متعدد قبیلوں میں رنگ کے لئے کوئی علیحدہ لفظ نہیں تھا جیسے رنگ دار اشیاء سے ممیز کیا جاتا۔ ایسے مجردات مثلاً آواز، سیکس، انواع، خلا، روح، جبلت، عقل، مقدار، امید، ڈر، معاملہ، شعور کے لئے الفاظ موجود نہیں، فکری ترقی کے ساتھ ساتھ ایسی مجرد اصطلاحات علت و معلول کے معکوس تعلقات سے پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور لطافت کے آلات اور تمدن کی علامتیں بن جاتی ہیں۔

لفظوں نے انسان کو اتنا کچھ دیا کہ یہ مقدس لگنے لگے۔ یہ جادوئی فارمولوں کا مواد بنے۔ ان کی توقیر اس وقت زیادہ تھی جب یہ زیادہ بے معنی تھے، ان سے نہ صرف سوچ میں وضاحت و فصاحت آئی بلکہ بہتر معاشرتی تنظیم بھی وجود میں آئی۔ انہوں نے تعلیم کے بہتر ذرائع اور علم و فنون کے ابلاغ سے نسلوں کو ذہنی طور پر مربوط کیا۔ انہوں نے ابلاغ کا ایسا رابطہ تخلیق کیا جس سے ایک نظریہ یا عقیدہ لوگوں کو ایک متجانس وحدت میں ڈھال سکتا تھا۔ انہوں نے تصورات کے سفر کی نئی شاہراہیں کھولیں اور زندگی کی وسعت و مفہوم کو کشادگی بخشی۔ کیا کوئی دوسری ایجاد طاقت اور عظمت میں اسم نکرہ کی ہمسر ہو سکتی ہے۔

سوچ کی وسعت کے بعد گویائی کا سب سے بڑا تحفہ تعلیم تھا۔ تہذیب آرٹ، دانش، عادات و اطوار اور اخلاق کا خزانہ ہے۔ جس سے فرد ذہنی ترقی

میں اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ ہر نسل کی نسلی وراثت کے اس دوری اکتساب کے بغیر تہذیب اتفاقی موت مرجائے گی۔ اس کی زندگی تعلیم کی مرہونِ منت ہے۔ غیر متمدن لوگوں کی تعلیم میں غیر ضروری نمود و نمائش نہیں تھی۔ ان کے لئے تعلیم فقط مہارت کا ابلاغ اور کردار کی تربیت تھی۔ نو آموز کا استاد سے بھرپور رشتہ ہوتا تھا۔ اصل براہِ راست اور عملی تربیت سے غیر متمدن بچے کی نمو میں تیزی پیدا ہوتی۔ اوماہا قبیلوں میں دس سال کی عمر تک لڑکا اپنے باپ کے تمام فنون سیکھ لیتا اور عملی زندگی کے لئے تیار ہو جاتا۔ الیوٹوں میں دس سال کا لڑکا خود اپنا گھر بناتا اور بعض اوقات بیوی بھی حاصل کر لیتا۔ نائیجریا میں چھ یا آٹھ سال کے لڑکے اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر اپنا جھونپڑا بناتے اور شکار اور ماہی گیری کے ذریعے زندگی گزارتے۔ اکثر یہ تعلیمی طریقہ کار جنسی زندگی کے آغاز کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بیش از وقت بلوغت کے ساتھ بیش از وقت جمود بھی پیدا ہو گیا۔ ان حالات میں بارہ سال کا لڑکا بالغ اور پچیس سال کا بوڑھا ہو جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ 'وحشی انسان' کا ذہن طفلانہ تھا بلکہ یہ کہ اُس کے پاس جدید بچے کی طرح کی سہولتیں اور مواقع نہیں تھے۔ وہ طویل اور محفوظ طفولیت نہیں گزار سکتا تھا جو تہذیبی ورثے کا زیادہ مکمل ابلاغ کرتی۔ مصنوعی اور مستحکم ماحول کے خلاف متنوع اور لچکدار ردِ عمل کو سامنے لاتی ہے۔ فطری انسان کا ماحول نہ زیادہ دیرپا تھا۔ اس کے لئے ذہنی چستی کی نہیں بلکہ ہمت اور کردار کی ضرورت تھی۔ جس طرح جدید تعلیم عقل پر بھروسہ کرتی ہے اسی طرح غیر متمدن باپ کردار پر بھروسہ کرتا تھا۔ وہ عالم فاضل نہیں بلکہ انسان بنانے کے چکر میں تھا۔ چنانچہ باضابطہ شرکت کی رسوم، جو نوجوان کی بلوغت تک پہنچنے اور قبیلے کی رکنیت حاصل کرنے کی نشاندہی

کرتی تھیں، کا مقصد حوصلے کا امتحان تھا علم کا امتحان نہیں۔ ان کا وظیفہ نوجوان نسل کو جنگ کی سختیوں اور شادی کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتا تھا۔ اس قسم کی باضابطہ شرکت کے بعض امتحانات "بہت زیادہ خوفناک اور باغیانہ ہیں"۔ کافروں میں جو لڑکے بلوغت کے امیدوار ہوتے انہیں دن کے وقت مشکل کام کرنے کو دیا جاتا اور رات کے وقت سونے سے روکا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ تھکن سے چور ہو کر گر پڑتے۔ اسے زیادہ یقینی بنانے کے لئے انہیں شدید تازیانے رسید کئے جاتے یہاں تک کہ ان کے جسم سے خون پھوٹ نکلتا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے لڑکے مر جاتے۔ لیکن شاید ان کے بڑے اس معاملے کو بقائے اصلح کی امدادی پیش بینی کے طور پر زیادہ فلسفیانہ طریقے سے سوچتے تھے۔ اکثر یہ باضابطہ شرکت کی رسمیں لڑکپن کے خاتمے اور شادی کی تیاری کی نشاندہی کرتی تھیں۔ دلہن اصرار کرتی کہ دولہا تکلیف برداشت کرنے کے حوصلے کا ثبوت فراہم کرے۔ کانگو کے کئی قبیلوں میں باقاعدہ شرکت کی رسم ختنے کی صورت میں ادا ہوتی۔ اگر نوجوان جھرجھری لیتا یا چیختا تو اس کے رشتہ داروں کو پیٹ دیا جاتا اور اس کی ہونے والی دلہن جو اس رسم کو بغور دیکھتی اسے حقارت سے یہ کہہ کر مسترد کر دیتی کہ اسے اپنے خاوند کے طور پر ایک لڑکی قبول نہیں۔

غیر متمدن تعلیم میں تحریر کا استعمال نہیں تھا۔ فطری لوگوں کو جو چیز بہت حیران کرتی تھی وہ اہل یورپ کا طویل فاصلے کے باوجود تحریری رابطہ تھا۔ بہت سے قبیلوں نے اپنے مہذب استعمال کرنے والوں کی نقل سے لکھنا سیکھ لیا تھا۔ لیکن بعض قبیلے مثلاً شمالی افریقہ پانچ ہزار سال تک پڑھی لکھی قوم کے ساتھ تعلق کے باوجود ناخواندہ رہے۔ سادہ قبیلے جو مقابلتاً تنہائی کی

زندگی گزارتے اور تاریخ نہ ہونے کی مسرتوں سے آشنا تھے۔ تحریر کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ ان کی یادداشتیں اتنی مضبوط تھیں کہ انہیں کچھ یاد رکھنے کے ذرائع درکار نہیں تھے۔ وہ جو کچھ جانتے اُسے اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھتے جو تاریخی ریکارڈ اور تہذیبی ورثہ ضروری ہوتا اُسے اپنے بچوں تک زبانی منتقل کر دیتے تھے۔ اس زبانی روایت اور لوک ورثہ کی بنا د پر ادب وجود میں آیا۔ تحریر کی ایجاد کی ایک لمبے عرصے تک اس لئے مخالفت کی جاتی رہی کہ یہ اخلاق کا بیڑہ غرق کر دے گی۔ ایک مصری اسطور کے مطابق جب دیوتا تھوتھ نے اپنی تحریر کی ایجاد کا انکشاف بادشاہ تامس کے سامنے کیا تو اس بھلے بادشاہ نے اسے تہذیب کا دشمن اور ملعون قرار دیا۔ بادشاہ نے احتجاج کیا "کہ بچے اور جوان جو اپنے پڑھے ہوئے کو یادداشتوں میں محفوظ رکھتے ہیں تحریر کے ذریعے خود پر انحصار کرنا اور اپنی یادوں سے کام لینا چھوڑ دیں گے"

بے شک ہم اس عظیم الشان کھلونے کی بنیاد کے متعلق صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غالباً یہ ظروف سازی کی ضمنی پیداوار اور مٹی کے برتنوں پر ٹریڈ مارک کے طور پر شروع ہوئی۔ شاید قبیلوں کے درمیان تجارت کے فروغ سے لکھے ہوئے اشاروں کا نظام ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدائی شکلیں تجارتی اشیاء کی روایتی تعداد یہ تھیں۔ جس طرح تجارت کے ذریعے مختلف زبانوں کے قبیلوں کا آپس میں تعلق پیدا ہوا اُس کے لئے باہمی طور پر قابلِ فہم طریقۂ کار اور ابلاغ ضروری ہو گیا۔ غالباً سب سے پہلے لکھی ہوئی علامتیں اعداد تھے جو عموماً متوازی نشانیوں کی شکل کر کے ہاتھ کی انگلیوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہم آج بھی ہندسے گننے کے لئے انگلیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسے الفاظ مثلاً Five جرمن لفظ Funf اور یونانی لفظ Pente کا اصل مطلب ہاتھ ہے۔ اسی طرح رومی

اعداد انگلیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ V ایک پھیلے ہوئے ہاتھ کی نمائندگی کرتا تھا۔ X دو V تھے جو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ تحریر اپنی ابتداء میں، جیسا کہ آج بھی چین اور جاپان میں موجود ہے۔ ڈرائنگ اور آرٹ بنانے کی شکل میں تھی۔ جیسے جب تک انسان نے لفظوں کا استعمال نہیں کیا تھا اُس نے جسمانی حرکات و سکنات سے کام لیا۔ اسی طرح اُس نے اپنی سوچ کی ترسیل کے لئے تصویریں استعمال کیں۔ ہر حرف اور لفظ کبھی ایک تصویر تھا۔ قدیم چینی تصاویر جو تحریر کی پیش رو تھیں انہیں Ku-Wan کہتے تھے۔ جس کا مطلب "اشاراتی تصاویر" ہے۔ طوطم کے پوب پکٹوگراف تحریر تھے جیسا کہ میسّن بتاتا ہے یہ قبائلی آٹوگراف تھے۔ بعض قبائل یادداشت کی مدد یا کسی پیغام کی ترسیل کے لئے دندان دار لاٹھیاں استعمال کرتے تھے۔ بعض دوسرے قبائل مثلاً الگون کوئن انڈین نہ صرف لاٹھیوں کو دندانے دار بناتے بلکہ ان پر تصویر کشی بھی کر دیتے جو چھوٹے چھوٹے طوطم چوب بن جاتے یا شاید یہ چوب بڑے پیمانے پر دندانے دار لاٹھیاں تھیں۔ پیرو و یا کے انڈین اعداد اور تصورات کا پورا ریکارڈ مختلف رنگوں کی ڈوریوں کو گانٹھیں لگا کر رکھتے تھے۔ غالباً جنوبی افریقی انڈین کی زندگی پر اس حقیقت سے بھی کچھ روشنی پڑتی ہے کہ مشرقی آرکی پیلاگو اور پولی میں ایسا ہی دستور تھا۔ لاؤتزے نے چینیوں کو سادہ زندگی کی طرف لوٹنے کی تاکید کرتے ہوئے مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنے گانٹھوں والی ڈوریوں کے ابتدائی استعمال تک جا سکتے ہیں۔

تحریر کی زیادہ ترقی یافتہ شکلیں فطری انسان میں پھیلی ہوئی ملتی ہیں رساؤتھ سینز کے آئیسٹر جزیرے پر موروثی تحریر کے سکرپٹ ملے ہیں۔ کیرولین جزیرے پر ایک ایسا سکرپٹ دریافت ہوا جو اکیاون رنگی علامتوں پر مشتمل ہے اور تصاویر و تصورات کی عکاسی کرتا ہے۔ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایسٹر جزیرے

کے پروہت اور سردار تحریر کا سارا علم اپنے تک محدود رکھنا چاہتے تھے اور کس طرح لوگ ہر سال پڑھی جانے والی لوحیں سننے کے لئے اکٹھے ہوتے تھے، اپنے ابتدائی مراحل میں تحریر ایک پُراسرار اور پاک چیز تھی۔ ہم اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ پولی نیسیا کے یہ مسودے تاریخی تہذیبوں سے ماخوذ نہیں تھے۔ بہرطور تحریر تہذیب کی علامت ہے۔ متمدن اور غیر متمدن انسان کے درمیان تاریک امتیازات میں سے سب سے کم غیر یقینی ہے۔

ابتداء میں لٹریچر الفاظ تھے نہ کہ حروف۔ یہ پروہتائی بھجن یا جادو کے حسن کے طور پر پیدا ہوتا ہے، جیسے عموماً پروہت ادا کرتے تھے اور یادداشتوں میں زبانی کلامی منتقل ہو جاتا تھا۔ رومی شاعری کو Carmina کہتے تھے جس کا مطلب اشعار اور افسوں تھا۔ یونانیوں میں لفظ Ode کا مطلب جادو تھا یہی مطلب انگریزی لفظ Rune اور Lay اور جرمن لفظ Lied کا ہے۔ شاید وزن Rhythm اور میٹر فطرت اور جسمانی زندگی کے تناسب سے ماخوذ تھا جسے بظاہر جادوگروں نے ترقی دی تھی تاکہ اپنی شاعری کے منتروں کی ترسیل کی جائے اور انہیں بڑھایا جائے۔ یونانیوں نے پہلی بحریں ڈیلفی کے پروہتوں سے منسوب کی تھیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ انہوں نے عبادت خانوں میں دیوتاؤں سے صلاح مشورے کے لئے بحریں ایجاد کی تھیں۔ بتدریج ان پروہتائی بنیادوں سے شاعر خطیب اور مؤرخ شاہی کارناموں کا ریکارڈ رکھنے والا، شاعر مقدس بھجن گانے اور دلیرانہ اساطیر کو محفوظ رکھنے والا اور موسیقار داستانوں کو موسیقی میں ڈھالتا جس سے لوگوں اور بادشاہوں کی تربیت ہوتی تھی۔ چنانچہ فجی، تبیتی اور نیو میکیڈونیا میں سرکاری خطیب اور راوی ہوتے تھے جو خاص مواقع پر تقاریر کرتے تھے۔ قبیلے کے جنگجوؤں کو ان کے باپ دادا کے کارنامے سنا کر ان میں ولولہ پیدا کرتے اور قوم

کی ماضی کی بے نظیر عظمتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے۔ بعض معاصر مورخین کی ان سے کتنی مماثلت ہے۔ شمالیوں کے پاس سرکاری شعراء تھے جو گاؤں گاؤں گاتے پھرتے تھے۔ ان میں محبت کے گیت کم ہوتے تھے۔ وہ عموماً جسمانی دلیری، جنگ یا والدین اور بچوں کے تعلقات پر نظمیں پڑھتے تھے۔ یہاں الیسٹر جزیرے میں ملنے والی لوحوں پر ایک باپ کا نوحہ پیش ہے جو جنگ کی بدولت اپنی بیٹی سے جدا ہو گیا ہے۔

میری بیٹی کا بادبان
دشمن قبیلوں کی طاقت سے کبھی نہ ٹوٹا

میری بیٹی کا بادبان
ہونیٹی کی سازش سے محفوظ رہا
وہ اپنی تمام جنگوں میں فاتح رہی
اُسے معدنی گلاس میں زہریلا پانی پلانے کے لئے
ورغلایا نہ جا سکا۔
کیا کبھی میرا دکھ رفع ہو سکتا ہے؟
ہمیں سمندروں نے جدا کر دیا ہے
اے میری بیٹی، اے میری بیٹی
میں وسیع اور پُرآب راستے سے افق کو دیکھتا ہوں
میری بیٹی، اے میری بیٹی

سائنس II

ہربرٹ سپنسر کی مستند رائے کے مطابق تحریر کی طرح سائنس کا آغاز بھی پروہتوں نے شروع کیا جس کی ابتداء فلکی مشاہدات سے ہوئی۔ مذہبی تہواروں میں جاری رہا اور اسے مندروں میں محفوظ رکھا گیا اور پروہتائی ورثہ کے طور پر اگلی نسلوں کو منتقل کر دیا گیا۔ اس معاملے میں بھی ہم شروعات کے بارے میں قیاس پر انحصار کرتے ہیں۔ غالباً تہذیب کی طرح سائنس کا آغاز بھی زراعت اور جیومیٹری سے ہوا۔ جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے جیومیٹری زمین کی پیمائش تھی، فصلوں اور موسموں کے حساب کتاب کے لئے ستاروں کے مشاہدے اور کیلنڈر کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے شاید علم ہیئت نے جنم لیا۔ جہاز رانی سے علم ہیئت میں ترقی ہوئی، تجارت سے ریاضی اور صنعتی فنون سے فزکس اور کیمسٹری کی بنیادیں پڑیں۔

گنتی غالباً گویائی کی پہلی شکلوں میں سے ایک تھی اور بہت سے قبیلوں میں آج بھی یہ ایک خوشگوار سادگی کا مظہر ہے۔ تسمانین دو تک گنتے تھے "ایک دو اور بہت"۔ برازیل کے گورانین زیادہ دور تک گئے "ایک، دو، تین، چار، لاتعداد"۔ نیو ہالینڈرز کے پاس تین اور چار کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ تین وہ "دو۔ایک" کو کہتے اور چار "دو۔دو" کو کہتے تھے۔ دمارا کے باشندے دو بھیڑوں کے بدلے چار لاٹھیاں نہیں دیتے تھے بلکہ دو مرتبہ ایک بھیڑ دو لاٹھیوں کے بدلے دیتے تھے۔ پہلے گنتی انگلیوں پر گنی جاتی تھی، پھر اعشاری نظام وجود میں آیا۔ چنانچہ جب کچھ وقت کے بعد بارہ کے تصور تک رسائی حاصل ہو گئی تو یہ عدد بہت پسندیدہ بن گیا کیونکہ پہلے چھ میں سے پانچ اعداد بارہ کو تقسیم کرتے تھے۔

چنانچہ اثنا عشریہ نظام پیدا ہوا جو آج بھی انگریزی پیمائش کے نظام میں زندہ ہے۔ ایک سال میں بارہ ماہ، ایک شیلنگ میں بارہ پنیس، ایک درجن میں ۔رہ اکائیاں، ایک گرس میں بارہ درجن، ایک فٹ میں بارہ انچ۔ اس کے برعکس تیرہ تقسیم نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ ہمیشہ کے لئے بدقسمت عدد بن گیا۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں پاؤں کی انگلیوں کے اضافے کے ساتھ بیس کا تصور ابھرا اور فرانس میں اس عدد کا استعمال کثرت سے کیا گیا۔ جسم کے باقی حصوں نے پیمائش کے سٹینڈرڈ کا کام دیا، ہاتھ ایک بالشت (نو انچ) ایک انچ کے لئے ایک انگوٹھا (فرانسیسی زبان میں دونوں لفظ ایک ہی معنی دیتے تھے) ایک کہنی آدھے گز کے لئے، ایک ایل ایک بازو کے برابر اور پاؤں ایک فٹ کے برابر تھا۔ ابتدائی زمانے میں انگلیوں کے ساتھ گنتی میں کنکریوں کا اضافہ کر لیا جاتا۔ لفظ Abacus اور کنکری Calculus جو لفظ Calculated میں مخفی ہے ہمارے لئے ایک مرتبہ پھر انکشاف کرتی ہے کہ ابتدائی ترین اور جدید ترین انسان میں کتنا کم فرق ہے۔ تصوریو اس غیر متمدن سادگی پہ مرتا اور اس ہمہ گیر تاثر کا اظہار کرتا "ایک دیانت دار شخص کو اپنی دس انگلیوں سے زیادہ گننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بعض معاملات میں وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں کا اضافہ کر سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں ہمارے معاملات دو یا تین کی طرح ہوتے چاہئیں۔ سو یا ہزار کی طرح نہیں۔ دس لاکھ گننے کی بجائے آدھے درجن تک گنو اور اپنے حساب کتاب کو انگوٹھے کے ناخن تک رکھو۔"

اجسامِ فلکی کی حرکت سے وقت کی پیمائش غالباً علمِ ہیئت کی ابتدا تھی۔ لفظ Measure لفظ Month کی طرح (اور غالباً لفظ Man پیمائش کرنے والا) Moon چاند کی طرف دلالت کناں ہیں۔ سالوں میں وقت کی پیمائش کرنے سے

بہت پہلے انسان نے چاند کے ذریعے وقت کی پیمائش کی۔ باپ کی طرح سورج بھی مقابلتاً بعد کی دریافت تھی۔ حتیٰ کہ آج بھی ایسٹر کا حساب کتاب چاند کی رویت سے ہوتا ہے۔ پولی نیشین کا کیلنڈر تیرہ ماہ کا تھا جس کی ضابطہ بندی چاند سے ہوتی تھی۔ جب ان کا قمری سال موسموں کے مقابلے سے علیحدہ ہو جاتا تو وہ ایک چاند کم کر کے توازن حاصل کر لیتے۔ لیکن آسمانوں کا ایسا معقول استعمال بہت کم ہوتا تھا۔ علمِ نجوم، علم ہیئت سے زیادہ پرانا ہے۔ سادہ لوگ وقت بتانے کی بجائے قسمت بتانے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ انسانی مقدار اور کردار کے بارے میں ستاروں کے اثر کی بابت لاتعداد توہمات پیدا ہو گئے۔ ان میں سے بہت سارے توہمات آج بھی زندہ ہیں۔ غالباً یہ توہمات نہیں بلکہ سائنس کے مقابلے میں ایک اور قسم کی غلطی ہیں۔

فطری انسان طبیعات کی تشکیل نہیں کرتا بلکہ اسے بروئے کار لاتا ہے، وہ پروجیکٹائل کا صحیح راستہ نہیں بتا سکتا لیکن تیر صحیح نشانے پر باندھتا ہے، اس کے پاس کیمیائی علامتیں نہیں لیکن وہ ایک نظر میں بتا دیتا ہے کہ کون سا پودا زہریلا اور کون سا قابلِ خورد ہے۔ وہ گوشت میں لگی چوٹ کو ٹھیک کرنے کے لئے جڑی بوٹیاں استعمال کرتا ہے۔ ہمیں یہاں پھر تذکیر و تانیث میں امتیاز کرنا چاہیئے۔ غالباً پہلی ڈاکٹر عورتیں تھیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ مردوں کی فطری نرسیں تھیں اور نا ہی اس لئے کہ وہ دایا کا کام کرتی تھیں بلکہ زمین سے قریبی تعلق کے سبب انہیں پودوں کا اعلیٰ علم حاصل ہوا اور انہوں نے پروہتوں کے جادو ٹونے سے الگ ادویات کے علم کو فروغ دیا۔ ابتدائی زمانے سے لے کر اس زمانے تک جو ہماری یادداشتوں میں محفوظ ہے عورتیں ہی علاج معالجہ کرتی تھیں۔ جب عورت علاج کرنے میں ناکام ہو جاتی تب

غیر متمدن مریض طبیب یا شاماں کے پاس جاتا تھا۔

یہ بات بہت حیران کُن ہے کہ غیر متمدن طبیب بیماری کے متعلق اپنے نظریات ۔ جس سے مراد جسم کا کسی اجنبی قوت یا روح کے غلبے میں آجانا ہے ۔ کے باوجود کتنے علاج کرتے تھے۔ اُن کا بیماری کا نظریہ آج کے جراثیم کے نظریے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جو علم طب میں آج حرفِ عام ہے۔ علاج کا سب سے عام طریقہ جادوئی منتر تھے جو بدروح کو قابو کر لیتے یا اسے بھگا دیتے تھے۔ علاج کا یہ طریقہ کتنا عام تھا اس کو گاڈرین سوئر کی کہانی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ آج بھی بہت سارے لوگ مرگی کو اسی قسم کا غلبہ سمجھتے ہیں۔ بعض معاصر مذاہب جھاڑ پھونک اور جنتر منتر کو بیماری بھگانے کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ دواؤں کے ساتھ دعاؤں کے اثر کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ غالباً جدید طریقہ کار کی طرح قدیم طریقہ کار بھی مشوروں کی شفا بخش قوت پر منحصر تھا۔ ان ابتدائی طبیبوں کے داؤ ان کے متمدن جانشینوں سے زیادہ ڈرامائی تھے۔ وہ خوفناک ماسک چڑھا کر بھوت کو بھگانے کی کوشش کرتے، اُنہوں نے جانوروں کی کھالیں اوڑھی ہوتیں، چلاتے، چیختے، زور زور سے ہاتھوں پر ہاتھ مارتے، شوروغوغا مچاتے اور کھوکھلی ٹیوب میں سے بھوت کو باہر کھینچتے۔ "فطرت بیماری کو ٹھیک کرتی جبکہ علاج مریض کا دل بہلاتا ہے"؛ برازیل کے بورورد سائنس کو اعلیٰ سطح پر لے گئے کہ باپ جب اپنے بیمار بچے کو دوائی دیتا تو بچہ تقریباً ٹھیک ہو جاتا۔

جڑی بوٹیوں کے علاوہ غیر متمدن انسان کے ذخیرۂ ادویات میں خواب آور دوائیں بھی ہوتی تھیں جو درد کو کم کرتے اور آپریشن کرنے کے دوران کام آتی تھیں۔ کیوریرے جیسا زہر (جو اکثر تیروں کی نوک پر لگایا جاتا تھا) حشیش افیون اور یوکلپٹس کی طرح کی دوائیاں تاریخ سے زیادہ پُرانی ہیں۔ ایک بہت

مشہور بے ہوشی کی دوا پیروؤں کی کوکا ہے۔ کارٹیز بتاتا ہے کہ کس طرح ایزٹیکس ہیملاک کی چھال سے استقربوط[1] کا علاج کرتے تھے۔ غیر متمدن سرجری میں کئی قسم کے آپریشن اور آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ بچے کی پیدائش کا خوب بندوبست کیا جاتا، زخم اور ہڈی کی ٹوٹ پھوٹ کو مہارت سے ٹھیک کر دیا جاتا۔ شیشے کے چاقوؤں یا چقماق کے تیز پتھر سے خون بہایا جاتا، پھوڑے کو خشک کیا جاتا، اور نسوں کو بچھا جاتا۔ قدیم پیروین انڈین سے لے کر جدید ملینیسن تک کھوپڑی کا آپریشن غیر متمدن طبیب کرتے تھے۔ جدید ملینیسن کے اوسطاً ہر دس میں سے نو آپریشن کامیاب رہتے جبکہ یہی آپریشن ۱۷۸۶ء میں پیرس کے ہوٹل ڈیو میں مہلک ثابت ہوا۔

ہم آج مہنگے علاج کے دور میں غیر متمدن جہالت پر مسکراتے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر اولیور وینڈل ہومز نے اپنی ساری زندگی علاج کرنے کے بعد لکھا ہے :-

"صحت اور زندگی کی حفاظت کے لئے ایسا کوئی کام نہیں جو انسان نہیں کرے گا اور اُس نے نہ کیا ہو۔ اُس نے پانی میں آدھا ڈوب کر دیکھا اور گیسوں میں اُس کا آدھا دم گھٹ گیا، تھوڑی دیر زمین میں دفن ہوا، گرم لوہے سے جھلسا، گوشت میں چبھتی سوئیاں برداشت کیں اور جلد پہ آگ جلائی۔ ان تمام قابلِ نفرت کاموں کو برداشت کرنا اور اس سب کی قیمت ایسے ادا کرنا کہ یہ کوئی بہت بڑا اعزاز ہو، جیسے چھالے بہت بڑی نعمت اور علاج معالجہ ایک عیاشی ہو۔"

---

[1] استقربوط ایک مرض ہے جو فسادِ خون سے پیدا ہوتا ہے۔ مسوڑھے سوج جاتے ہیں جسم ... رہتا ہے

III آرٹ

آرٹ کے پچاس ہزار سال گزرنے کے بعد آج بھی انسان جبلت اور تاریخ میں اس کے سرچشموں پر بحث کرتا ہے، حسن کیا ہے؟ ہم اس کی تعریف کیوں کرتے ہیں؟ ہم اسے تخلیق کرنے کی کاوش کیوں کرتے ہیں؟ چونکہ یہاں نفسیاتی گفتگو کی گنجائش نہیں لہذا ہم اختصار سے جواب دیں گے کہ حسن وہ خاصیت ہے جو کسی شے یا کسی بھی شکل میں ہو دیکھنے والے کو خوش کرتی ہے۔ بنیادی طور پر کوئی شے دیکھنے والے کو محض اس لئے خوش نہیں کرتی کہ وہ حسین ہوتی ہے بلکہ وہ دیکھنے والے کو خوش کرتی ہے اس لئے اُسے حسین لگتی ہے۔ جو شے شوق کی تسکین کرتی ہے خوبصورت لگتی ہے۔ بھوک سے مرتے ہوئے انسان کو کھانا خوبصورت لگے گا، کوئی منظر حسین نہیں لگے گا۔ ہو سکتا ہے کہ خوش کن شے دیکھنے والوں کی طرح کی نہ ہو۔ ہمارے اپنے ذاتی خیال میں کوئی شکل اتنی خوبصورت نہیں ہوتی جتنی ہماری اپنی اور آرٹ کا آغاز اپنے جسم کی تزئین ہی سے ہوتا ہے۔ خوش کن منظر جان پیدر محبوبہ بھی ہو سکتی ہے۔ تب حسِ جمال جنس کی شدت اور تخلیقی اُبیج پر پہنچ جاتی ہے۔ یوں حسن کی مہک ہر اُس شے میں پھیل جاتی ہے جس کا محبوبہ سے تعلق ہوتا ہے۔ ان تمام ہستیوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے جن میں اس کی مشابہت ہوتی ہے۔ تمام رنگ جو اس کی تزئین کرتے ہیں، تمام زیورات اور ملبوسات جو اُس پہ جچتے ہیں، تمام اشکال اور حرکات جو اس کی خوش اقدامی اور لطافت کی یاد دلاتے ہیں حسین لگنے لگتے ہیں۔ خوش کن شکل ایک محبوب مرد بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں جو کشش پیدا ہوتی

ہے اُس کا نتیجہ ہے جو کمزور سے طاقت کی پوجا کرواتی ہے یوں الوہیت کا تصور پیدا ہوتا ہے — قوت کی موجودگی میں تسکین — جو تمام ارفع آرٹ کی تخلیق کرتی ہے۔ آخر میں فطرت بذاتِ خود الوہی اور خوبصورت ہو سکتی ہے، فقط اس لئے نہیں یہ صرف عورت کی نزاکت اور مرد کی طاقت کا روپ بھرتی ہے بلکہ اس لئے کہ ہم اس میں اپنی خوش قسمتی اور احساسات، دوسروں کے لئے اپنی محبت اور خود اپنے لئے اپنی محبت بھر دیتے ہیں — اس میں اپنی جوانی کے نظارے بھر دیتے ہیں، زندگی کے ہنگاموں سے فرار حاصل کر کے آسودگی چاہتے ہیں، اس کے تمام انسانی موسموں — سرسبز جوانی، سرگرم بلوغت ادھیڑ عمری اور سرد بڑھاپے میں زندہ رہتے ہیں۔ ہم اسے اُس ماں کے ہیولے میں دیکھتے ہیں جس نے زندگی عطا کی اور جو موت پر بھی اپنا دامن وا کر دے گی۔

آرٹ حسن کی تخلیق ہے یہ ایسی شکل میں سوچ یا احساس کا اظہار ہے جو حسین یا ارفع لگتا ہے اور ہمارے اندر وہ خوشی پیدا کرتا ہے جو عورت مرد کو یا مرد عورت کو دیتا ہے۔ سوچ زندگی کے مفہوم تک رسائی اور احساس زندگی کی تلخیوں سے خلاصی ہے۔ یہ صورت ہمیں آہنگ کے ذریعے تسکین دے سکتی ہے۔ آہنگ جو ہمارے سانس کے ساتھ، خون کی گردش، سردیوں اور گرمیوں، نشیب و فراز، دن رات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے یا یہ ہمیں تناسب ساخت کے ذریعے خوشی پہنچا سکتی ہے جو ایک ساکن آہنگ ہے۔ یہی صورت قوت کی نمائندگی کرتی، ہمیں پودوں اور جانور، عورت اور مرد کے باسلیقہ تناسب کی یاد دلاتی ہے یا یہ ہمیں رنگ کے ذریعے خوش کر سکتی ہے جو روح میں چمک اور زندگی میں شدت پیدا کرتا ہے اور آخر میں یہ صورت

ہمیں سچائی کے ذریعے مسرور کر سکتی ہے کیونکہ نظرت یا حقیقت کی شفاف اور واضح نقل جو کسی پودے یا جانور کے فنا پذیر حُسن یا کسی واقعہ کے شتابی مفہوم کا احاطہ کرتی ہے، ہماری فرصت اور تفہیم کے لئے اسے جامد کر دیتی ہے۔ ان متعدد ماخذات سے زندگی کی عظیم الشان جہتیں پیدا ہوتی ہیں — گیت، رقص، موسیقی، ڈرامہ، ظروف سازی مصوری، مجسمہ سازی، فنِ تعمیر، ادب، فلسفہ — فلسفہ کیا ہے؟ ایک آرٹ — تجربے کے انتشار کو "معنی خیز صورت" دینے کی ایک اور شکل۔

غیر متمدن معاشرے میں تصورِ حُسن کے زیادہ وقیع نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جنسی خواہش اور اس کی تکمیل میں تاخیر کی کمی مطلوبہ فرد کے متعلق تخیلاتی وسعت کا وقت مہیا نہیں کرتی۔ یہ تخیلاتی احساس فردِ مطلوبہ کے حُسن کو تشکیل کرتا ہے۔ غیر متمدن انسان عورت کا انتخاب اُس کے حسن کی بجائے سود مندی کی بنیاد پر کرتا تھا۔ وہ ایک جفاکش عورت کو اس کی بد صورتی کی وجہ سے مسترد کرنے کے متعلق کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ جب ہندوستان کے ایک سردار سے اُس کی محبوب ترین بیوی کے متعلق پوچھا گیا تو اُس نے اس سلسلے میں معذرت کی کہ اُس نے اِس پہلو پر کبھی نہیں سوچا۔ اُس نے فرینکلن کی بالغ نظری سے جواب دیا "ان کے چہرے کم و بیش خوبصورت ہو سکتے ہیں لیکن باقی پہلوؤں سے عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں"۔ اگر غیر متمدن انسان میں تصورِ حسن کہیں موجود بھی تھا تو یہ ہمارے تصور سے بہت مختلف تھا۔ رچرڈ کہتا ہے "جتنی نیگرو نسلوں کو میں جانتا ہوں اُن میں اس عورت کو خوبصورت سمجھا جاتا جس کی کمر پتلی نہ ہو، جس کا جسم بغل سے لے کر کولہوں تک ہموار — "سیڑھی" — کی طرح ہو۔ بعض افریقی مردوں میں ہاتھی کے سے کان اور لٹکتا پیٹ عورت کے حسن کی علامت ہے اور سارے افریقہ میں موٹی عورت کو سب سے زیادہ

دلکش سمجھا جاتا ہے۔ منگو پارک کہتا ہے "نائیجریا میں موٹاپے اور حُسن کو مترادف الفاظ سمجھا جاتا ہے۔ ایک اوسط درجے کی عورت بھی ایسی ہونی چاہیئے جو ہر بازو کے نیچے ایک غلام کے بغیر نہ چل سکتی ہو۔ مکمل خوبصورت کا وزن اٹھانے کے لیئے ایک اونٹ کی ضرورت ہے۔" بریفالٹ کہتا ہے "وحشی انسان زیادہ تر عورت میں ایسے خدوخال کو ترجیح دیتا جو عموماً پسند نہیں کیئے جاتے یعنی لمبی لمبی لٹکتی ہوئی چھاتیاں۔" ڈاروِن کہتا ہے "بہت ساری ہوٹنٹاٹ عورتوں کا پچھلا حصّہ حیرانی کی حد تک اُبھرا ہوتا ہے" ـــــ اور سر انیڈریو سمتھ کو یقین ہے کہ مرد اس خصوصیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اُس نے ایک مرتبہ ایک عورت کو دیکھا جسے بہت حسین خیال کیا جاتا تھا وہ پیچھے سے اس قدر موٹی تھی کہ جب ہموار زمین پر بیٹھتی تو اٹھ نہ سکتی تھی وہ اپنے آپ کو آگے دھکیلتی یہاں تک کہ وہ کسی ڈھلوان جگہ پر پہنچ جاتی۔ برٹن کے مطابق سمالی مرد اپنی بیوی کا انتخاب اس طرح کرتے کہ عورتوں کو قطار میں کھڑا کر دیتے اور اس عورت کا انتخاب کرتے جس کا پچھلا حصّہ زیادہ فربہ اور پھیلا ہوا ہوتا۔ کسی نیگرو کے لیئے اس سے مخالف صورت سخت قابلِ نفرت ہے۔

درحقیقت یہ بات اغلب ہے کہ فطری مرد حُسن کو عورت کے اعتبار سے دیکھنے کی بجائے اپنے اعتبار سے دیکھتا تھا۔ آرٹ کی ابتداء گھر سے ہوئی۔ غیر متمدن مرد غرور و تفاخر میں جدید انسان کے برابر تھا۔ عورت کو یہ بات ناقابلِ یقین لگے گی۔ فطری لوگوں میں جانوروں کی طرح عورت کی بجائے مرد زیور پہنتا تھا۔ بونوک کہتا ہے "آسٹریلیا میں زیبائش پر مکمل طور پر مرد کی اجارہ داری ہے۔"

اسی طرح میلنیسیا، نیو گیانا، نیو کیلیڈونیا، نیو برٹن، نیو ہینوور اور

شمالی امریکی انڈین میں بھی زیبائش پر مردوں ہی کی اجارہ داری ہے۔ بعض قبائل میں کسی اور کام پر اتنا وقت صرف نہ کیا جاتا جتنا جسم کی زیبائش پر صرف ہوتا تھا۔ بظاہر آرٹ کی پہلی شکل جسم کو مصنوعی طور پر رنگنا ہے۔ بعض اوقات اس کا مقصد عورتوں کی توجہ حاصل کرنا اور بعض اوقات دشمنوں کو ڈرانا ہوتا تھا۔ آسٹریلوی باشندے ہمیشہ اپنے ساتھ سفید، سرخ اور زرد رنگ کا روغن لئے پھرتے تھے تاکہ کثرت سے اپنا حُسن سنوار سکیں۔ جب یہ اشیاء ختم ہو جائیں تو وہ دور دراز کی مہم جوئی اور خطرے کے باوجود انہیں حاصل کر لیتا۔ عام دنوں میں وہ گالوں، کندھوں اور سینے پر رنگ کے کچھ دھبے لگا کر مطمئن ہو جاتا لیکن تہوار کے دنوں میں اگر اُس کا پورا جسم رنگا ہوا نہ ہوتا تو اُسے بہت شرم محسوس ہوتی۔

بعض قبائل میں جسم رنگنے کے حقوق مردوں کے لئے مخصوص تھے بعض قبیلوں میں شادی شدہ عورتوں کو گردن پر رنگ لگانا ممنوع تھا۔ لیکن عورتیں سب سے پہلے آرٹ ـــ کاسمیٹک ـــ کو حاصل کرنے میں زیادہ پیچھے نہ رہیں۔ جب کیپٹن کک نیوزی لینڈ میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ جب اُس کے ملاح ساحل سے واپس آئے تو ان کی ناکیں مصنوعی طور پر سُرخ یا پیلے رنگ کی تھیں۔ مقامی لوگوں کا روغن ان کی ناک پر چڑھ گیا تھا۔ وسطی افریقہ کی قلاطہ خواتین دن کے کئی گھنٹے اپنی زیبائش پر صرف کرتیں۔ وہ اپنی انگلیوں اور انگوٹھوں پر ساری رات مہندی کے پتے چپکائے رکھتیں جس سے وہ ارغوانی ہو جاتے تھے، وہ اپنے دانت نیلے، ارغوانی اور پیلے رنگوں سے رنگتیں، اپنے بالوں پر نیل لگاتیں اور اپنی آنکھوں کی پتلیوں پر سُرمہ لگاتیں۔ ہر بانگو عورت اپنے ڈریسنگ کیس میں چمٹی رکھتی جس سے وہ اپنے ابرو اُوپر کو

اُٹھاتی تھیں۔ بالوں کی سوئیاں، انگوٹھیاں، گھنٹیاں، بٹن اور بکسوئے رکھتی تھیں۔
غیر متمدن روح پیر یکلز کے یونان کی طرح رنگ و روغن کی ناپائیداری پر
مضطرب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اُس نے نقوش بنانا، بچھونا اور ملبوسات کو زیادہ
پائیدار زیبائش کے طور پر ایجاد کیا۔ بہت سارے قبیلوں میں عورتیں
اور مرد رنگ دار سوئیوں سے اپنے ہونٹوں پر سوراخ کے ذریعہ گودا لگانے
کے لئے بخوشی تیار ہو جاتے۔ گرین لینڈ میں مائیں اپنی بیٹیوں کو ابتدائی عمر
میں گودا لگا دیتی ہیں تاکہ جلدی سے ان کی شادی ہو جائے۔ تاہم اکثر اوقات
گودا لگانے کو کافی کم یا غیر مؤثر سمجھا جاتا تھا اور زمین کے ہر حصے پر کئی قبیلے
اپنے گوشت پر گہرے زخم لگاتے تاکہ اپنے ساتھیوں کے لئے دلکش اور دشمنوں
کے لئے حوصلہ شکن بن جائیں۔ تھیوفائیل گاتیر کہتا ہے " ان کے پاس کشیدہ کاری
کے لئے کپڑے نہیں تھے وہ اپنی کھالوں پر کشیدہ کاری کرتے تھے"۔ چقماق
کے ٹکڑے گوشت کو کاٹ دیتے اور زخم کو زیادہ بڑا کرنے کے لئے اکثر اس
میں مٹی ڈال دی جاتی۔ ٹورس سٹریٹس کے باشندے بڑے بڑے زخم کے
نشان لئے پھرتے جیسے سپاہیوں کی وردی کے کندھے پر جھبے ہوتے ہیں۔
ابیوکنا خود کو اس طرح سے کاٹتے کہ اُن کے جسم پر چھپکلی، گھڑیال یا کچھوے
جیسے نشانات بن جائیں۔ جارج کہتا ہے "جسم کا کوئی ایسا حصہ نہیں جس کی
تکمیل نہ کی گئی ہو۔ سجاوٹ، بد شکلی، رنگ و روغن، گودا لگانا، شکل بدلنا،
یعنی پھیلایا یا سیکڑا نہ گیا ہو۔ یہ فقط زیبائش کی نمائش کے لئے تھا۔ بوتوکدوس
اس پلگ سے اپنا نام حاصل کرتے جو وہ آٹھ سال کی عمر میں نچلے والے ہونٹ
اور کانوں میں ڈالتے۔ اسے بار بار بڑے پلگ سے تبدیل کرتے رہتے یہاں
تک کہ سوراخ چار انچ قطر کا ہو جاتا۔ کانوں کی بالیاں اور ناک کی نتھ فیشن

تھیں۔ نگیس کینڈ کے باشندے یقین رکھتے تھے کہ جو ناک کی نتھ کے بغیر مرگیا اگلے جہان خوفناک اذیت برداشت کرے گا۔ وہ ملاح جس کو گودا نگا دیا گیا تھا وحشیوں کے متعلق ہمدردانہ الفاظ استعمال کرتا ہے اور یورپ کا طالب علم غیر متمدن قطع و برید سے خوفزدہ ہو کر اپنے باعزت زخمیوں کی حمایت کرتا ہے۔

ابتداء میں پوشاک زیبائش کی ایک شکل، جنسی رکاوٹ یا پُرکشش تھی۔ سردی یا شرم کے لئے استعمال کی جانے والی شے نہ تھی۔ کیریؔ ننگے لوگوں کو برف پر لٹا کر ان پر پھسلتے تھے۔ جب ڈاروؔن نے فیوجی کے لوگوں پر ترس کھا کر انہیں سردی سے بچنے کے لئے سُرخ کپڑا دیا تو انہوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زیبائش کے طور پر استعمال کیا۔ جیسے کُکؔ نے اُن کے متعلق کہا ہے کہ وہ ہمیشہ ننگا رہنے سے مطمئن تھے لیکن خوبصورت نظر آنا چاہتے تھے۔ اسی طرح اورینیکو کی خواتین نے وہ کپڑے پھاڑ دیئے جو عیسائی پادریوں نے انہیں دیئے تھے۔ ان کے ربن بنا کر گردن کے ساتھ لٹکا دیئے۔ ان کا اصرار تھا کہ انہیں کپڑے پہن کر شرم آئے گی۔ ایک پُرانا مصنّف برازیل کے باشندوں کے متعلق بیان کرتا ہے کہ وہ عموماً عریاں ہوتے تھے اور کہتا ہے "کچھ لوگوں نے کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے لیکن وہ صرف فیشن کے طور پر کپڑے استعمال کرتے، ستر پوشی کی خاطر نہیں۔ جب انہیں کپڑے پہننے کا حکم ملا تو وہ صرف ٹوپی پہنتے اور باقی کپڑے گھر رکھ دیتے۔ جب پوشاک کی حیثیت زیبائش سے زیادہ ہو گئی تو یہ جزوی طور پر وفادار بیوی کے شادی شدہ منصب کی نشاندہی کرنے لگی اور جزوی طور پر عورت کے حُسن اور صورت پر زور دینے کے لئے استعمال ہونے لگی۔ زیادہ تر غیر متمدن عورت، بعد کی عورت کی طرح، پوشاک اپنی عریانی کو ڈھانپنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی دلکشی بڑھانے کے

لئے استعمال کرتی تھی۔ عورت اور مرد کے علاوہ ہر چیز متغیر ہے۔

شروع سے دونوں اصناف لباس سے زیادہ زیورات کو ترجیح دیتے تھے۔ غیر متمدن لوگ بہت کم ضروریاتِ زندگی کی تجارت کرتے۔ زیادہ تجارت زیبائش اور کیسل کی اشیاء تک محدود تھی۔ زیور تمدن کے عناصر میں سب سے قدیم عنصر ہے۔ قبروں میں بیس ہزار سال پرانے ٹکڑوں اور دانتوں کے بنے ہوئے نیکلس ملے ہیں۔ سادہ آغاز سے زیبائش و آرائش جلد ہی مؤثر تناسب تک پہنچ گئی اور زندگی میں اونچا کردار ادا کیا۔ گالا خواتین نے چھ پونڈ وزن کی بالیاں پہنی ہوتی تھیں، بعض ڈنگا عورتیں پچاس پونڈ وزن کے زیورات سے لدی ہوتی تھیں، ایک افریقی حسینہ تانبے کی بالیاں پہنتی تھی جو دھوپ میں گرم ہو جاتیں چنانچہ اُسے ایک ملازم رکھنا پڑتا تاکہ وہ اُن پر سایہ کرے یا اُسے پنکھا جھلے۔ وابونیاس کی ملکہ بیس پونڈ وزنی پیتل کا کالر لٹکائے رکھتی چنانچہ اُسے تھوڑی دیر بعد آرام کے لئے لیٹنا پڑتا تھا۔ جن غریب عورتوں کے پاس صرف ہلکا زیور ہوتا وہ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں جنہوں نے بہت بھاری بوجھ اٹھایا ہوتا تھا۔

گویا آرٹ کا پہلا ماخذ نر جانور کا بیاہ کے وقت رنگوں اور بال و پر سے جسم کو سجانے اور خوبصورت بنانے کے عمل سے ملتا ہے۔ جس طرح اپنے سے محبت اور اپنے ہجولی سے محبت جب زیادہ ہو جاتی ہے تو زائد محبت کو فطرت میں انڈیل دیتے ہیں۔ اسی طرح شخص آرائش کی خوشخصیت سے نکل کر خارجی دنیا کا رُخ کرتی ہے۔ روح معروضی طریقوں ــــ رنگ اور شکل کے ذریعے ــــ سے اپنے احساس کا اظہار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

آرٹ درحقیقت اُس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان اشیاء کو

خوبصورت بنانے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ شاید اس کا پہلا خارجی ذریعہ ظروف سازی تھا۔ ظروف ساز کا چاک تحریر اور ریاست کی طرح تاریخی تمدن کا حصہ ہے۔ لیکن اس کے بغیر بھی غیر متمدن انسان بلکہ عورت نے اس قدیم صنعت کو مٹی، پانی، ہنرمند انگلیوں سے شکلوں کے حیران کن تناسب کے ذریعے آرٹ بنا دیا۔ اس کی گواہی جنوبی افریقہ کے بیروانگارہ اور پیبلو انڈین کی ظروف سازی ہے۔

جب ظروف ساز نے برتن کی سطح پر رنگین ڈیزائن بنائے تو اس نے پینٹنگ کا آرٹ تخلیق کیا۔ غیر متمدن ہاتھوں میں پینٹنگ کوئی آزاد آرٹ نہیں تھا بلکہ یہ ظروف سازی اور مجسمہ سازی کے ساتھ ملحق تھا۔ فطری انسانوں نے مٹی سے رنگ بنائے اور اینڈمینیوں نے پیلی مٹی کے ساتھ ملا کر روغنی رنگ بنائے۔ ایسے رنگ ہتھیار، اوزار، برتن، کپڑے اور مکانوں کو سجانے میں استعمال ہوتے تھے۔ افریقہ اور لوسیانا کے متعدد شکاری قبیلے اپنی غاروں کی دیواروں یا اردگرد کی چٹانوں پر ان جانوروں کی واضح تصویریں بناتے جن کا وہ شکار میں پیچھا کرتے تھے۔

پینٹنگ کی طرح مجسمہ سازی کا آغاز بھی غالباً ظروف سازی ہی سے ہوا ہے۔ ظروف ساز نے دیکھا کہ وہ نہ صرف استعمال کی اشیاء بنا سکتا ہے بلکہ ایسی نقلی اشکال بھی بنا سکتا ہے جو جادو کے ہتھکنڈوں کے طور پر کام آسکیں۔ اور اس کے علاوہ حسین اشیاء کا کام بھی دیں۔ اسکیمو کریبو کے سینگ اور دریائی گائے کے دانتوں سے انسانوں اور جانوروں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بناتے۔ غیر متمدن انسان اپنے جھونپڑے، طوطم پول یا قبر پر کوئی شبیہ بنا دیتا جو معبود شے یا مرے ہوئے شخص کی نشاندہی کرتی۔ پہلے پہل وہ صرف

چہرہ تراشتا تھا، پھر سر اور پھر پورا انسان تراشنے لگا۔ قبروں پر اس طرح نشان لگانے سے مجسمہ سازی کی ایک آرٹ بن گئی۔ چنانچہ ایسٹر جزائر کے قدیم باسی اپنے مُردوں کے مقبروں پہ بڑے بڑے یک سنگی مجسموں میں سرفہرست تھے۔ ایسے متعدد مجسمے ملے ہیں جن میں سے کئی بیس فٹ بلند ہوتے تھے بعض اب کھنڈرات میں پڑے ہیں جو بظاہر ساٹھ فٹ کے تھے۔

فنِ تعمیر کیسے شروع ہوا؟ ہم اتنی شاندار اصطلاح کا اطلاق غیر متمدن عہد کے جھونپڑے کی تعمیر پر مشکل سے کر سکتے ہیں کیونکہ فنِ تعمیر صرف تعمیر نہیں بلکہ خوبصورت تعمیر ہے۔ یہ اس وقت شروع ہوا جب پہلی مرتبہ کسی مرد یا عورت نے اقامت گاہ کو ظاہری حالت اور استعمال دونوں اعتبار سے دیکھا۔ غالباً کسی تعمیر کو حُسن اور رفعت دینے کی پہلی کوشش گھروں کی بجائے قبروں سے شروع ہوئی۔ جب یادگاری ستون مجسمہ بن گیا تب مقبرہ مندر بن گیا۔ کیونکہ غیر متمدن لوگوں کے لئے مردے زندہ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور تھے اس کے علاوہ مردے ایک جگہ رہ سکتے تھے جبکہ زندہ لوگ آوارہ گردی کرتے اور مستقل گھر کم بناتے تھے۔

ابتدائی زمانے میں اور غالباً چیزوں کو تراشنے اور مقبرے بناتے سے بہت پہلے انسان نے تناسب میں خوشی محسوس کی، جانور کی آواز، چہچہاہٹ اُچھل کود اور سیہ جھاڑنے کو گیت اور رقص میں ڈھالا۔ شاید جانور کی طرح بات کرنے سے پہلے گایا اور اُس نے گانے کے ساتھ ساتھ رقص کیا۔ درحقیقت غیر متمدن انسان نے رقص میں سب سے زیادہ اظہار پایا۔ اس نے اسے ابتدائی سادہ شکلوں سے لے کر پیچیدگی تک ترقی دی جس کی مثال تمدّن میں نہیں ملتی۔ اور اس کی ہزاروں شکلیں ترتیب دیں۔ قبیلوں کے بڑے بڑے تہوار اجتماعی

اور انفرادی رقص سے منائے جاتے۔ بڑی بڑی جنگیں عسکری رقص اور گیت سے شروع کی جاتیں۔ مذہب کی بڑی رسمیں، گیت، ڈرام اور رقص کا امتزاج تھیں آج جو باتیں ہمیں کھیل کی صورت لگتی ہیں۔ ابتدائی انسان کے لئے سنجیدہ معاملات تھے۔

انہوں نے رقص صرف اپنی ذات کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ دیوتاؤں سے گزارش کے لئے بھی کیا۔ مثال کے طور پر پیدائش کو روکنے کے لئے معیاری ترغیب رقص کی تنویم کے ذریعے دی جاتی۔ سپینسر نے رقص کا ماخذ اس رسم کو قرار دیا جو کسی فاتح سردار کی جنگ سے واپسی پر استقبال کے طور پر ادا کی جاتی تھی۔ فرائیڈ نے اسے شہوانی خواہش کے فطری اظہار اور عاشقانہ ہیجان کی گروہی تیکنیک سے ماخوذ کیا۔ اگر اسی تنگ نظری سے اس بات پر زور دیا جائے کہ رقص مقدس رسموں اور تماشوں سے پیدا ہوا اور پھر تین نظریوں کو ایک میں ضم کر دیا جائے تو رقص کا موجودہ تصور سامنے آجائے گا۔

ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رقص سے آلاتی موسیقی اور ڈرامہ پیدا ہوا۔ ایسی موسیقی اس خواہش کے نتیجے میں پیدا ہوئی کہ رقص کے توازن کو آواز کے ساتھ تیز کیا جائے اور حب الوطنی اور پیدائش کے لئے ہیجان پیدا کیا جائے۔ آلات وسعت اور تکمیل کے اعتبار سے محدود تھے۔ لیکن اقسام میں غیر مختتم تھے۔ مقامی ذہین لوگ کر سنگھا، ڈھول، گھڑیال، ٹنٹنا، گھنگھرو، چکچکی، بانسری اور ڈھول جیسے آلات سینگوں، کھال، ہاتھی دانت، پیتل، تانبا، بانس اور لکڑی سے بناتے اور تراش خراش اور رنگ و روغن سے اس کی زیبائش کرتے۔ کمان کا تنا ہوا دھاگا سینکڑوں آلات غیر متمدن بربط سے جدید وائلن اور پیانو تک کی بنیاد بنا۔ پیشہ ور رقاصوں کی طرح پیشہ ور گویے بھی قبیلوں میں ہی پیدا

ہوئے اور مبہم سکیل جو کہ مدہم سروں میں ہوتے تھے، ترقی کر گئے۔

موسیقی، گیت اور رقص کی آمیزش نے "وحشی انسان" نے ہمارے لئے ڈرامہ اور ڈانس ڈرامہ تخلیق کیا۔ چونکہ غیر متمدن رقص اکثر نقالی تھا اس میں جانوروں اور انسانوں کی حرکات و سکنات کی نقل اُتاری گئی اور ایکشن اور واقعات کا سوانگ بھرا گیا۔ بعض آسٹریلوی قبیلے ایک کھائی جس پر جھاڑی کی زیبائش ہوتی کے گرد رقص پیش کرتے جو شرم گاہ کی نمائندگی کرتی۔ پُر جوش شہوانی اداؤں کے بعد اپنے نیزے علامتی طور پر خندق میں گاڑ دیتے۔ اسی جزیرے کے شمال مغربی قبیلے موت اور روزِ حشر کا ڈرامہ کھیلتے جو سادگی میں "قرونِ وسطیٰ کے ڈراموں اور جدید جذباتی ڈراموں سے مختلف تھا۔ رقاص آہستہ آہستہ زمین پر لیٹ جاتے، اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی شاخوں میں سر چھپا لیتے اور موت کا بہانہ کرتے۔ پھر اپنے لیڈر کے اشارے پر وہ یکدم زبردست فتح مندی کی آواز اور رقص کے ساتھ اٹھتے اور روح کے دوبارہ زندہ ہونے کا اعلان کر دیتے۔ اسی انداز میں ہزاروں خاموش سوانگوں سے قبیلے کی تاریخ کے اہم واقعات یا فرد کی زندگی کے اہم واقعات بیان کئے جاتے۔ جب ان میں سے توازن غائب ہو گیا تو رقص ڈرامے میں منتقل ہو گیا۔ یوں آرٹ کی ایک عظیم ترین شکل وجود میں آئی۔

اس طرح سے قبل از تمدن انسان نے تمدن کی بنیادیں اور شکلیں تخلیق کیں۔

غیر متمدن کلچر کے اس مختصر سروے پر نظر ڈالتے ہوئے بجز تحریر اور ریاست ہم تہذیب کے ہر عنصر کو موجود پاتے ہیں۔ ہمارے لئے معاشی زندگی کے تمام طریقے ایجاد کر لئے گئے ہیں۔ شکار، ماہی گیری، غلّہ بانی، کاشت کاری، نقل و حمل تعمیر، صنعت و تجارت، مالیات، سیاسی زندگی کا سادہ ڈھانچہ منظم ہو چکا

ہے۔ جرگہ، خاندان، دیہی کمیونٹی اور قبیلے؛ آزادی اور نظم و ضبط ــــ دو ایسے دشمن نقاط ہیں جن کے گرد تمدن گھومتا ہے۔ جب پہلی مرتبہ مصالحت کرتے ہیں تو قانون اور انصاف شروع ہوتے ہیں۔ اخلاقیات کی مبادیات وجود میں آچکی ہیں، بچوں کی تربیت، جنس کی باضابطگی، اخلاق و عادات اور وفاداری میں توقیر اور عمدگی کا پیدا ہونا، مذہب کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ اخلاق کی حوصلہ افزائی اور گروہ کی مضبوطی کے لئے مذہب کی امیدیں اور خوف کا اطلاق ہوتا ہے۔ گفتار پیچیدہ زبانوں میں ترقی کر گئی۔ طب اور جراحت کا آغاز ہوا، اور سائنس، ادب اور آرٹ میں معمولی شروعات ہو چکی ہیں۔ بہر طور یہ حیران کن تخلیق کی تصویر ہے۔ انتشار سے ہیئت وجود میں آرہی ہے۔ جانور سے عاقل کی طرف سفر شروع ہو رہا ہے۔ ان "وحشیوں" اور ان کے ہزاروں سینکڑوں سال کے تجربے کے بغیر تمدن وجود میں نہ آتا ہم ہر چیز میں ان کے ممنون ہیں ــــ جس طرح ایک خوش قسمت مگر نالائق بیٹا اپنے بزرگوں کی طویل مشقت سے حاصل کردہ کلچر، سلامتی اور سہولیات وراثت میں لے لیتا ہے

چھٹا باب

قبل از تاریخ تہذیب کی شروعات

قدیم حجری ثقافت

تہذیب کے عوامل کو جاننے کے لئے جن غیر متمدن تہذیبوں کا ہم نے خاکہ کھینچا ہے وہ لازمی طور پر ہمارے آباؤ اجداد نہیں تھے۔ کیونکہ جتنا ہم جانتے ہیں وہ اعلیٰ تہذیبوں کی ابتر باقیات ہو سکتی ہیں جنہیں اُس وقت زوال آیا جب گھٹتی ہوئی برف کی بدولت انسان نے خطِ سرطان سے شمالی معتدل خطوں کی طرف رُخ کیا۔ ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ عموماً کس طرح تہذیب پیدا ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ ہمیں ابھی خصوصاً اپنی تہذیب کی قبل از تاریخ ابتداء کا سراغ لگانا ہے۔ اب ہم اختصار کے ساتھ اُن اقدامات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں جن کے ذریعے انسان نے تاریخ سے پہلے تاریخ کی تہذیبوں کی تیاری کی۔ کس طرح جنگل یا غار کا انسان مصری معمار، بابل و نینوا کا ہیئت دان، عبرانی پیغمبر، فارسی فرمانروا، یونانی شاعر، رومی انجینئر، ہندو مہاتما، جاپانی مصوّر اور چینی دانا بنا؟ ہمیں علم البشریات میں سے گزر کر علم آثارِ قدیمہ سے ہوتے ہوئے تاریخ تک جانا چاہیئے۔

پورے کرۂ ارض پر متجسس ذہن زمین کو کھود رہے ہیں۔ بعض سونا نکالنے کے لئے بعض چاندی، لوہا اور بعض کوئلہ نکالنے کے لئے جبکہ ان میں سے بہت سے علم کے لئے زمین کو کھود رہے ہیں۔ ان لوگوں کی عجیب و غریب مصروفیت کو

دیکھئے کہ سوئی کے کناروں سے حجری آلات و اوزار کھود کھود کر نکال رہے ہیں۔ گردن اوپر کر کے قبل از تاریخی غاروں کی چھتوں پر بنی ہوئی تصاویر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ چاؤ کاؤ تین پر پرانی کھوپڑیوں کو دریافت کر رہے ہیں۔ موہنجو داڑو اور یوکٹان کے مدفون شہروں کا انکشاف کر رہے ہیں۔ مصری ملعون مقبروں سے ملبہ نکال رہے ہیں، منوس اور پری ایم کے محلات سے مٹی اٹھا رہے ہیں ــــ پرسیپولیس کے کھنڈرات کو عیاں کر رہے ہیں، کارِ تھیج کی باقیات کے لئے افریقہ کی مٹی کھود رہے ہیں۔ جنگل میں اینگ کور کے عظیم الشان مندروں کو دوبارہ تسخیر کر رہے ہیں۔ ۱۸۳۹ء میں جیکس بوشیر دی پرتھیس کو فرانس میں ابی ویلی کے مقام پر پہلے پتھر کے عہد کے چقماق ملے۔ نو سال تک دنیا اُسے بھولا بادشاہ سمجھ کر ہنستی رہی۔ ۱۸۷۲ء میں شلیمان نے اپنے پیسے اور تقریباً اپنے ہاتھوں سے ٹرائے کے سب شہروں میں سے کم قدیم شہر کو کھودا لیکن ساری دنیا بے یقینی سے مسکراتی رہی۔ کسی صدی میں بھی تاریخ میں اس قدر دلچسپی نہیں لی گئی جتنی انیسویں صدی میں لی گئی۔ اس میں شیمپولین نے نوجوان نپولین کے ساتھ ۱۷۹۶ء میں مصر کا سفر کیا۔ نپولین خالی ہاتھ واپس لوٹا جبکہ شیمپولین اپنے قبضے میں گزشتہ اور موجودہ سارے مصر کو ساتھ لے آیا۔ اس وقت کے بعد ہر نسل نے نئی تہذیبیں اور ثقافتیں دریافت کیں اور انسانی ارتقاء کے علم کی سرحدوں کو مزید پیچھے دھکیلتی گئیں۔ ہماری قاتل انواع میں کوئی شے اس عظیم تجسس ــــ سمجھنے کا انتھک اور بے دھڑک جذبہ ــــ کا مقابلہ نہیں کرتی۔

۱۔ قدیم پتھر کے عہد کا انسان

غیر متمدن انسان کے متعلق اپنے علم کو بڑھانے اور جہالت کو چھپانے کے

لئے بے حساب کتابیں لکھی گئیں۔ ہم دوسرے پُر فکر علوم کے لئے قدیم اور جدید انسان کا تذکرہ چھوڑتے ہیں۔ یہاں ہمارا مسئلہ ابتدائی حجری دور اور متاخر حجری دور کی تہذیبوں کا ہماری معاصر زندگی میں کردار کا کھوج لگانا ہے۔

اس کہانی کے پس منظر کے طور پر ہمیں جو تصویر مرتب کرنی ہے وہ اس زمین سے بہت مختلف ہے جس میں آج ہم بس رہے ہیں۔ ایسی زمین جو وقفوں وقفوں سے یخ بستگی سے کانپ رہی ہے۔ جنہوں نے ہمارے معتدل خطوں کو ہزاروں سال سے شمالی قطب بنا دیا ہے۔ بڑھتی ہوئی برف کے سامنے ہمالیہ، ایلپس، پائرینیس جیسی چٹانوں کے ڈھیر اکٹھے کر دیئے ہیں۔ اگر ہم موجودہ سائنس کے نازک نظریات کو قبول کرلیں تو یہ مخلوق جو بونا سیکھ کر انسان بنی ان موافق انواع میں سے ایک تھی جو ان منجمند صدیوں میں بچ گئیں۔ یخ بستگی کے درمیانی مرحلوں میں جب برف پیچھے کی طرف ہٹ رہی تھی، اس عجیب وجود نے آگ دریافت کی۔ پتھر اور ہڈی سے ہتھیار اور اوزار بنانے کا فن سیکھا اور اس طرح تمدن کی راہ ہموار کی۔

بہت ساری باقیات ایسی ملی ہیں جنہیں قبل از تاریخ انسان کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ڈبلیو، سی پائی ایک نوجوان چینی حیاتیات دان کو چاؤ کاؤ ٹین کے غار سے، جو پیکنگ سے ستائیس میل دور ہے، ایک کھوپڑی ملی ہے جسے ایپے بروئیل اور جی۔ ایلیٹ سمتھ جیسے ماہرین نے انسانی قرار دیا ہے۔ کھوپڑی کے نزدیک آگ کے نشانات اور ایسے پتھر موجود تھے جنہیں آلات کے طور پر استعمال کیا گیا۔ لیکن انسان سے متعلق ان نشانیوں کے ساتھ جانوروں کی ہڈیاں تھیں جسے متفقہ طور پر ابتدائی برفانی دور سے منسوب کیا گیا جو دس لاکھ سال پہلے تھا۔ اکثر کی رائے کے مطابق پیکنگ کی یہ کھوپڑی

ہمارے علم کے مطابق قدیم ترین انسانی رکازہ Fossil ہے اور اس کے نزدیک جو اوزار ملے ہیں وہ انسانی تاریخ میں پہلے اوزار ہیں۔ انگلستان کی کاؤنٹی سیکسس میں پلٹ ڈاؤن کے مقام پر ڈاسن اور ووڈ ورڈ کو ۱۹۱۱ء میں کچھ انسانی حصے ملے ہیں جسے اب "پلٹ ڈاؤن کا انسان" کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ جو تاریخیں منسوب کی گئی ہیں وہ دس لاکھ سے بارہ لاکھ پچاس ہزار سال پرانی ہیں۔ اسی قسم کی غیر یقینی باتیں اس کھوپڑی اور ران کی ہڈی کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں جو ۱۸۹۱ء جاوا کے مقام پر ملی اور جبڑے کی ہڈی ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ کے مقام پر ملی۔ بلاشبہ سب سے پہلے انسانی جسم کی باقیات ۱۸۵۷ء میں جرمنی کے مقام نینڈرتھل میں دریافت ہوئیں۔ ان کے متعلق اندازہ ہے کہ یہ چالیس ہزار سال قبل از مسیح پرانی ہیں اور بلجیئم، فرانس اور سپین میں دریافت ہونے والی انسانی باقیات سے مشابہت رکھتی ہیں۔ گلیلی کے سمندر کے ساحل پر "نینڈرتھل نسل" کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو ہمارے عہد سے چالیس ہزار سال پہلے یورپ پر قابض تھے۔ ان کا قد چھوٹا لیکن ان کی کھوپڑی سولہ سو مکعب سینٹی میٹر تھی جو ہماری کھوپڑیوں سے دو سو گنا زیادہ ہے۔

یورپ کے ان قدیم ترین باشندوں کو ایک نئی نسل کرومیگنن نے تقریباً بیس ہزار سال قبل مسیح یورپ سے نکالا۔ اس نسل کی یادگاریں ۱۸۶۸ء میں جنوبی فرانس کے مقام ڈورڈون سے ملیں اسی نمونے اور عہد کی بہت ساری باقیات فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور ویلز کے کئی مقامات پر کھود کر نکالی گئی ہیں۔ ان باقیات سے زبردست طاقت اور قد و قامت کے لوگوں کی نشاندہی ہوتی ہے جن کا قد پانچ فٹ دس انچ سے لے کر چھ فٹ چار انچ تک اور کھوپڑی ۱۵۹۰ سے ۱۷۱۵ مکعب سینٹی میٹر تھی۔ نینڈرتھل نسل کی طرح کرومیگنن کو بھی "غاروں کے

مکین" کے طور پر جانتے ہیں کیونکہ ان کی باقیات غاروں سے ملی ہیں لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ ان کی واحد رہائش گاہیں تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فقط ان ہی لوگوں کی ہڈیاں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو ملی ہوں جو غاروں میں رہتے تھے۔ حالیہ نظریے کے مطابق یہ عظیم الشان نسل وسطی ایشیا سے افریقہ کے راستے یورپ آئی اور افریقہ کو اٹلی اور سپین سے جوڑا۔ ان کی باقیات بتاتی ہیں کہ وہ یورپ پر قبضہ کرنے کے لئے نینڈرتھلوں سے کئی عشروں تک لڑتے رہے۔ جرمنی اور فرانس میں تحارب کتنا پڑا ہے۔ تاہم نینڈرتھل نسل غائب ہوگئی۔ کرومیگنن بچ گئے اور جدید مغربی یورپ کے مورثِ اعلیٰ بنے، اس تہذیب کی بنیاد رکھی جس کے آج یورپین وارث ہیں۔

قدیم پتھر کے زمانے کی ان تہذیبوں اور دوسری یورپی تہذیبوں کی باقیات کو ... بڑے حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم فرانس میں سب سے ابتدائی اور بڑی بنیادوں پر انحصار کرتی ہے۔ یہ تمام تہذیبیں ناتراشیدہ پتھر کے اوزار استعمال کرتی تھیں۔ پہلی تین تہذیبیں تیسرے اور چوتھے دوریخ بستگی کے دوران متشکل ہوئیں۔

ا۔ قبل شیلان Pre-Chellan تہذیب

یہ ایک لاکھ پچاس ہزار سال پرانی تہذیب ہے۔ اس میں جو چقماق کے پتھر پائے گئے ہیں وہ ناتراشیدہ اور اصلی حالت میں استعمال ہوتے تھے۔ لیکن بہت سے ایسے پتھر بھی ملے ہیں جو مٹھی کی طرح کے ہیں اور کچھ اعتبار سے گھڑے ہوئے بھی ہیں۔ شاید قبل شیلان تہذیب نے یورپی انسان کو یہ عزت بخشی کہ اس نے مٹھی نما پتھر کا پہلا اوزار بنایا۔

II شیلان تہذیب The Chellan Culture

یہ ایک لاکھ سال پرانی تہذیب ہے۔ اس تہذیب نے اس پتھر کو دونوں طرف سے گھڑ کر بہتر بنایا اور اسے بادام کی شکل دی اور ہاتھ کے لئے زیادہ موزوں بنایا۔

III آشیلین تہذیب The Acheulean Culture

تقریباً پچہتر ہزار سال پرانی تہذیب ہے۔ یورپ، گرین لینڈ، امریکہ، کینیڈا، میکسیکو، افریقہ، انڈیا اور چین میں اس کی باقیات کی بہتات ہے۔ اس نے مٹھی نما پتھر کے اوزار کو نہ صرف زیادہ موزوں بنایا بلکہ مخصوص اوزار مثلاً ہتھوڑے، اہرن، کھرپی، تیر کا سرا اور چاقو بھی بنائے۔ یہاں ہم معروف انسانی صنعت کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔

IV ماؤسٹیرین تہذیب The Mousterian Culture

یہ تہذیب تمام براعظموں پر ملتی ہے اور بالخصوص نینڈرتھل کی باقیات کے حوالے سے چالیس ہزار سال پہلے وجود رکھتی تھی۔ ان لوگوں میں چقماق اور مٹھی نما فرسودہ اوزار بہت کم ملتے ہیں۔ یہاں پہلے کی نسبت اوزار زیادہ موزوں، ہلکے، تیز اور خوبصورت بنائے جاتے، انہیں ماہر ہاتھ طویل عرصے کی مہارت کے بعد بناتے تھے۔

V اوریگنیشین تہذیب The Aurignacian Culture

یہ پچیس ہزار سال قبل انہ مسیح تاریخ ہے۔ یخ بستگی کے بعد کے عہد کی پہلی

صنعتیں اور کرو میگنن نسل کی پہلی معلوم تہذیب ــ سوئیاں ، ابرن ، صیقل گر وغیرہ کا پتھر کے اوزار میں اضافہ کیا گیا ۔ چٹانوں پہ خام کندہ کاری کی صورت میں آرٹ نمودار ہوا جن میں زیادہ تر برہنہ عورت کی تصویریں ہوتی تھیں ۔

VI سولوٹرین تہذیب The Solutrean Culture

یہ تہذیب بیس ہزار سال قبل مسیح پرانی ہے اور فرانس ، سپین ، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ میں نمودار ہوئی ۔ اورِگ نیشن عہد کے اوزاروں میں انی ، برما ، آری ، ہیر پھی اور نیزے کا اضافہ کیا گیا ۔ ہڈی سے پتلی اور تیز سوئیاں بنائی جاتی تھیں ۔ رینڈیر کے سینگوں سے بہت سارے اوزار تراشے جاتے تھے اور کبھی کبھار جانور کی شکل کی صورت رینڈیر کی انتڑیاں کندہ کی جاتیں جو آرِگ نیشن آرٹ سے زیادہ خوبصورت ہوتی تھیں ۔ بالآخر کرو میگنن تہذیب کے عروج پر میگڈ لینیاں تہذیب نمودار ہوئی ۔

VII میگڈ لینیاں تہذیب The Magdalenian Culture

یہ تہذیب پورے یورپ میں سولہ ہزار قبل مسیح میں نمودار ہوئی ۔ صنعت میں اس کا نمایاں امتیاز ہاتھی دانت ، ہڈی اور سینگ کے بنے ہوئے خوبصورت برتن اور خوبصورت سوئیاں تھیں ۔ آرٹ میں یہ کرو میگنن نسل کی خوبصورت تکمیل ــ الطمیرا کی ڈرائنگ ــــ کا زمانہ تھا ۔

قدیم پتھر کے عہد کی ان تہذیبوں کے ذریعے قبل از تاریخ انسان نے ان دست کاریوں کی بنیاد رکھی جو صنعتی انقلاب تک یورپی ورثے کا حصہ رہیں ۔ پیلیولیتھک صنعتوں کی وسعت کی وجہ سے ان کی کلاسیکل اور جدید تہذیبوں تک ترسیل

آسان ہو گئی۔ ۱۹۲۱ء میں رہوڈیشیا میں حاصل ہونے والی کھوپڑی اور غار کی تصویریں، ۱۸۹۶ء میں ڈی مارگن کے دریافت شدہ چقماق کے پتھر، سیٹن کار کی سمالی لینڈ میں پیلیو لتھک دریافتیں، فیوم کے حوض میں قدیم پتھر کے عہد کی اشیاء اور جنوبی افریقہ کی Still Bay تہذیب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تاریک براعظم قبل از تاریخ عہد کے ان ہی حالات سے گزرا جن کا ذکر ہم نے یورپ کا خاکہ کھینچتے ہوئے کیا تھا۔ درحقیقت شاید تیونس اور الجیریا میں تیم اوریگ نیشن باقیات اس مفروضے کو مستحکم کرتی ہیں کہ کرومیگنن نسل اصل میں افریقی تھی یا اس کا اختتام افریقی نسل میں ہوا۔ شام، انڈیا، چین، سائبریا اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں کھود کر پیلیو لتھک اوزار نکالے گئے۔ اینڈریوز اور اس کے عیسائی پیشروؤں نے انہیں منگولیہ میں پایا۔ نینڈرتھل ڈھانچے اور موس ٹیرین اوریگ نیشین پتھر کے چقماق فلسطین میں بہت بڑی مقدار میں کھود کر نکالے گئے۔ نیبراسکا میں ہڈی کے اوزار دریافت ہوئے جنہیں پانچ لاکھ سال قبل سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اوک لاہوما اور نیو میکسیکو میں تیروں کی نوکیں ملی ہیں۔ جن کے متعلق ان کے ڈھونڈنے والے بتاتے ہیں کہ تین لاکھ پچاس ہزار سال قبل مسیح کی ہیں۔ قبل از تاریخ انسان نے تاریخی انسان کو تہذیب کی بنیادیں فراہم کرنے کے لئے کتنے وسیع و عریض پل کو طے کیا۔

۲۔ قدیم پتھر کے عہد کے فنون

اپنے تصور کی لگام ڈھیلی چھوڑنے کے بجائے اگر ہم پیلیو لتھک انسان کے بنائے ہوئے اوزار کا احاطہ کریں تو ہمیں اُس کی زندگی کا زیادہ واضح تصور حاصل ہو جائے گا۔ ہاتھ کی مُشت میں آنے والا پتھر پہلا اوزار ہوگا۔ بہت سارے

جانوروں نے یہ بات انسان کو سکھائی ہوگی۔ چنانچہ ایک طرف سے نوکیلا پتھر جو مٹھی میں آسانی سے آسکے پہلے انسانوں کے لئے ہتھوڑا، کلہاڑا، چھینی، چاقو وغیرہ بن گیا۔ آج بھی بہ لحاظِ صرف لفظ Hammer کا مطلب پتھر ہے۔ بتدریج یہ مخصوص اوزار یکساں شکل سے مختلف شکلوں میں ڈھلتے چلے گئے۔ ہتھی لگانے کے لئے سوراخ کیئے گئے، آری بنانے کے لئے دندانے لگائے گئے اور تیر یا نیزہ بنانے کے لئے شاخوں کو تراشا گیا۔ پتھر کی کھرپی جس کی شکل سیپ کی طرح تھی بیلچہ یا کدال بن گئی، کھردری سطح کا پتھر رندا بن گیا۔ گوپھن میں پتھر جنگ کا ہتھیار بن گیا، جو کافی دیر تک رہا۔ ہڈی، لکڑی، ہاتھی دانت اور پتھر سے بیلیولیتھک انسان نے ہتھیاروں اور اوزاروں کی مختلف شکلیں صیقل کر، مارٹر، کلہاڑیاں، کھرپیاں ڈرل، چاقو، چھینی، بھالے، سندان، مٹھیا، خنجر، برچھی، چھانا، سُوا، سوئی اور بے شمار دیگر اشیاء بنائیں۔ ہر روز اُس کا پالا ایک نئے علم سے پڑتا اور بعض اوقات وہ اتفاقیہ دریافتوں سے مفید ایجادات کرتا تھا۔

لیکن انسان کی سب سے بڑی کامیابی آگ کی ایجاد تھی۔ ڈارون نے نشاندہی کی کہ اس طرح آتش فشاں پہاڑوں کے گرم لاوے نے انسان کو آگ کا فن سکھایا ہوگا۔ ایسکیلس کے مطابق پرومیتھیس نے لیمنوس کے جزیرے پر ہنیگ کا ڈنٹھل آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر رکھ کر آگ جلانا سکھایا۔ نینڈرتھل کی باقیات میں ہمیں تارکول کے ٹکڑے اور جلی ہوئی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اس طرح انسانی دریافت شدہ آگ چالیس ہزار سال پُرانی ہے۔ کرومیگنن لوگ چکنائی رکھنے کے لئے پتھر کے پیالے بناتے جسے وہ روشنی کے لئے جلاتے تھے، اسی طرح چراغ بھی خاصا پرانا ہے۔ آگ نے انسان کو بڑھتی ہوئی برف سے پڑنے والی سردی کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا۔ آگ نے اُسے رات

کے وقت زمین پر سونے کا اہل کیا، کیونکہ جس طرح غیر متمدن انسان اس سے خوف کھا کر اس کی پوجا کرتا تھا اسی طرح جانور بھی اس سے ڈرتے تھے۔ آگ نے اندھیرے پر فتح حاصل کر کے اس خوف کو کم کر دیا جو انسانی تاریخ کے کم سنہری جال میں دھاگا ہے۔ آگ سے کھانا پکانے کا فن پیدا ہوا اور اس سے پہلے جو ہزاروں کھانے ناقابلِ خورد تھے وہ اب انسانی خوراک میں شامل ہو گئے۔ آگ سے دھاتیں پگھلنے لگیں۔ یوں کرومیگنن عہد سے صنعتی انقلاب تک ٹیکنالوجی کی سب سے حقیقی ترقی آگ ہی تھی۔

ہمارے پاس پیلیولیتھک انسان کی یادگاریں فقط اُس کے آرٹ کے نمونے ہی ہیں۔ ساٹھ سال پہلے سینور ما سیلنیوڈی سوتالا نے اپنی جاگیر التمیرا —— شمالی سپین —— میں ایک بڑی غار دیکھی۔ ہزاروں سالوں سے گری ہوئی چٹانوں نے اس میں داخل ہونے کا راستہ بند کیا ہوا تھا۔ نئی تعمیر کے لئے کئے گئے دھماکو سے اتفاقاً داخلہ کُھل گیا۔ تین سال بعد سوتالا نے غار دریافت کی اور دیواروں پر کچھ عجیب و غریب نشانات دیکھے۔ ایک دن اُس کی بیٹی اُس کے ساتھ گئی کیونکہ اس کا قد باپ سے چھوٹا تھا اور وہ سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھ سکتی تھی۔ لہٰذا اُس نے چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں اُسے ایک بھینسے کی خوبصورت، رنگین مگر مبہم خطوط سے بنی تصویر نظر آئی۔ دیواروں اور چھت کو غور سے دیکھنے پر اور بھی بہت سی تصویریں نظر آئیں۔ جب ۱۸۸۰ء میں سوتالا نے اپنے ان مشاہدات پر مبنی رپورٹ شائع کی تو ماہرین آثارِ قدیمہ نے مسرور تشکیک کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ بعض نے جا کر ڈرائنگ دیکھیں مگر انہیں فقط کسی چکمہ دینے والے کی جعل سازی قرار دیا۔ تیس سال تک یہ بے یقینی قائم رہی۔ دوسری غاروں میں تصویروں کی دریافت سے انہیں قبل از تاریخ مان

لیا گیا۔ اس سے سوتالا کی رائے کی تصدیق ہو گئی لیکن اُس وقت سوتالا مر چکا تھا۔ ماہرین آثارِ قدیمہ التطمیرا آئے اور متفقہ طور پر اس بات کی توثیق کی یہ ڈرائنگ پیلیو لیتھک عہد کی تھیں۔ اب عام رائے کے مطابق التطمیرا کی یہ تصویریں اور قبل از تاریخ کا زیادہ تر آرٹ میگڈیلنین تہذیب سولہ ہزار سال قبل از مسیح سے منسوب ہے۔ قدیم پتھر کے عہد سے متعلق کچھ دیر بعد کی تصاویر فرانس کی بہت سی غاروں میں ملی ہیں۔

ان تصاویر کے زیادہ تر موضوعات جانور ہیں۔ رینڈیر، ہاتھی، گھوڑے، سور اور ریچھ۔ غالباً یہ ان کی پُر تعیش غذا کا حصہ تھے اس لئے شکار کا مرغوب جانور تھے۔ بعض اوقات جانور کے آر پار تیر گزارا جاتا۔ فریزر اور رینآخ کے مطابق اس سے جادو کی شبیہ بنانا مقصود ہوتا تھا جس سے جانور مغلوب ہو جاتا اور شکاری کے پیٹ میں پہنچ جاتا۔ قیاس غالب ہے کہ یہ سادہ آرٹ تھا جسے جمالیاتی تخلیق کی خالص مسرت کے لئے منقش کیا جاتا تھا۔ جادو کا مقصد پورا کرنے کے لئے خام اور بچتہ نقاشی سے کام چل سکتا تھا جبکہ یہ تصویریں اکثر اتنی نازک حسین اور مہارت سے بنائی گئی ہیں کہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ کم از کم آرٹ کے اس شعبے میں انسانی تاریخ اپنے طویل سفر میں اس مرحلے سے آگے نہیں بڑھی۔ یہاں زندگی، تحرک اور پاکیزگی کو خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے۔ خوبصورت خطوں کے ساتھ جانوروں کو زندہ کر دیا گیا ہے۔ کیا لیونارڈو کا 'Last Supper' یا ایل گریکو کا 'Assumption' ان کرو میگنن تصاویر کا آج بیس ہزار سال بعد بھی مقابلہ کر سکتی ہیں؟

پینٹنگ ایک دقیق آرٹ ہے جو اپنے اندر ذہنی اور تکنیکی ارتقاء کی کئی صدیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر ہم مروجہ نظریے کو قبول کر لیں (جو کہ ہمیشہ خطرناک بات

ہوتی ہے) تو پینٹنگ جنگ تراشی سے خاکہ تراشی اور رنگ بھرنے تک مجسمہ سازی سے وجود میں آئی ہے۔ پینٹنگ مجسمے سے حجم کی تفریق ہے۔

قبل از تاریخ درمیانی آرٹ کی خوبصورت نمائندگی کسی تیرانداز کے ابھرواں مجسمے یا فرانس میں لاسیل کے مقام پر کھڑی آریگ نیشیسن چٹانوں سے کی گئی ہے۔ فرانس میں آریگے کے مقام پر ایک غار میں تونیس بیجوان نے دیگر میگڈالینین یادگاروں کے ساتھ رینڈیر کی انتڑیوں سے تراشے ہوئے بہت سارے زیبائشی ہینڈل دریافت کئے ہیں۔ ان میں سے ایک زبردست مہارت کا حامل ہے۔ جیسے اس کے پیچھے آرٹ کی صدیوں کی روایت موجود ہو۔ سارے قبل از تاریخی بحیرہ روم، مصر، کریت، اٹلی، فرانس اور اسپین میں چھوٹی مگر موٹی عورتوں کی ان گنت تصویریں ملتی ہیں جو یا تو ماما کی پوجا کی نشاندہی کرتی ہیں یا افریقی تصورِ حسن کی علامتیں ہیں۔ چیکوسلواکیہ میں جنگلی گھوڑے، رینڈیر اور ہاتھی کے پتھر کے مجسمے دریافت کئے گئے ہیں جو تیس ہزار سال قبل از مسیح پُرانے ہیں۔

ترقی کے اعتبار سے تاریخ کی ساری تعبیر لڑکھڑا جاتی ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ یہ مجسمے، کم ابھرواں مجسمے اور تصاویر اُس آرٹ کا بہت چھوٹا سا حصہ ہیں جس نے قبل از تاریخ انسان کی زندگی کا اظہار اور اس کی تزئین کی۔ باقی ماندہ غاروں میں چھپا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ قبل تاریخ انسان اُس وقت فنکار تھا جب وہ غاروں میں رہتا تھا بلکہ اُس نے جاپانیوں کی طرح تن دہی سے سنگ تراشی کی، یونانیوں کی طرح بھرپور مجسمہ سازی کی۔ اس نے صرف غاروں ہی پر نقاشی نہیں کی بلکہ کپڑا، لکڑی ہر چیز پر نقش و نگار بنائے۔ یہاں تک کہ خود کو بھی اس سے الگ نہ رکھا ہو سکتا

ہے انہوں نے بچ جاتے والوں سے زیادہ اعلیٰ شاہکار تخلیق کئے ہوں۔ ایک گوشے میں ایسی ٹیوب دریافت ہوئی جو رینڈیر کی ہڈیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اور روغن سے بھری ہوئی تھی، ایک اور گوشے میں پیلی مٹی کے روغن سے بھری ہوئی ایک اور پلیٹ تھی جیسے دو سو صدیاں گذر چکی تھیں۔ بظاہر اٹھارہ ہزار سال پہلے فنون زیادہ ترقی یافتہ اور وسیع پیمانے پر بروئے کار لائے جاتے تھے۔ قبل تاریخی لوگوں میں پیشہ ور فنکاروں کا طبقہ بھی تھا اور ایسے لاابالی فنکار بھی تھے جو گھٹیا غاروں میں فاقے کر کے تجارتی پورٹریٹ کو ترک کر کے قدیم آرٹ تخلیق کر رہے تھے۔

۱۱ جدید حجری تہذیب

گزشتہ ایک سو سال میں فرانس، پرتگال، برازیل، جاپان اور مانچوریا میں قبل تاریخی یادگاروں کے ڈھیر ملے ہیں۔ ڈنمارک میں گھریلو غیر فردی اشیاء ملی ہیں۔ جس سے قدیم لوگوں کے باورچی خانوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان گندے ڈھیروں میں خول، خاص طور پر صدف، بحری صوفیہ، گھونگھے، مختلف زمینی اور دریائی جانوروں کی ہڈیاں، سینگوں، ہڈیوں اور غیر صیقل پتھروں کے ہتھیار اور اوزار، معدنی باقیات مثلاً تارکول، راکھ اور ٹوٹے ہوئے برتن شامل ہیں۔ یہ غیر استعمال شدہ یادگاریں ایک ایسی تہذیب کے اشارے ہیں جو آٹھ ہزار سال قبل از مسیح متشکل ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ قدیم حجری دور کے بعد کی تہذیب ہے لیکن ابھی تک صحیح طور پر جدید حجری دور میں نہیں تھی کیونکہ ابھی تک صیقل شدہ پتھر کے استعمال تک نہیں پہنچی تھی۔ ہم ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے یہ یادگاریں چھوڑیں،

اس بات کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ ان کا کوئی کیتھولک قسم کا ذوق تھا۔

مزدا ازیل کی قدرے پرانی تہذیب کے ساتھ یہ لوگ Mesolithic یا درمیانے حجری دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ دور قدیم اور جدید حجری دور کے درمیان ہے۔

۱۸۵۴ء میں موسم سرما خلافِ معمول خشک تھا، سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کی سطح گر گئی تھی اور قبل از تاریخ ایک اور عہد کا انکشاف ہوا۔ ان جھیلوں میں دو سو مقامات پر ایسے ڈھیر پائے گئے جو تیس سے ستر صدیوں تک پانی میں کھڑے رہے تھے۔ ان تودوں کی ترتیب اس بات کی نشان دہی کرتی تھی کہ ان پر چھوٹے چھوٹے گاؤں بنائے گئے تھے۔ شاید تنہائی یا دفاع کے لئے ہر ایک زمین کے ساتھ ایک تنگ پل کی مدد سے جڑا ہوا تھا۔ گھروں کے فریم ورک ادھر ادھر پانی کے کھیل سے بچے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کھنڈرات میں ہڈی اور پتھر کے صیقل زدہ اوزار تھے جو ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے لئے نئے حجری دور کی علامت بن گئے۔ جو ایشیا میں دس ہزار سال قبل از مسیح اور یورپ میں پانچ ہزار سال قبل از مسیح واقع ہوا۔ ان باقیات سے ملتے جلتے ڈھیر ایک عجیب نسل نے جنھیں ممٹیلہ ساز کہتے ہیں، مسیسپی کی وادیوں میں چھوڑے۔ ان کے متعلق ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے کہ ان ٹیلوں میں قربان گاہوں جیومیٹری کی شکلوں اور طوطم جانوروں کی شکل پر پتھر، ہڈی اور کوٹی ہوئی دھات کی اشیاء ملتی ہیں جو ان پُراسرار لوگوں کو جدید حجری دور کے آخر میں رکھتی ہیں۔

اگر ہم ان باقیات میں سے جدید حجری دور کی تصویر بنانے کی کوشش کریں تو ہم فوراً ایک چونکا دینے والی ایجاد ـــــ زراعت ـــــ کو

دیکھتے ہیں۔ ایک اعتبار سے ساری انسانی تاریخ دو انقلابوں پر مشتمل ہے۔

ا۔ جدید حجری شکار سے زراعت کا سفر

اا۔ جدید زراعت سے صنعت کا سفر

کوئی دوسرا انقلاب ان دونوں جتنا حقیقی اور بنیادی اہمیت کا حامل نہیں۔

ان باقیات سے پتہ چلتا ہے کہ جھیلوں کے رہنے والے گندم، باجرا، رائی، مکئی اور جوی، اس کے علاوہ ایک سو بیس قسموں کے پھل اور بہت سارے خونے کھاتے تھے۔ ان کھنڈرات میں ہل نہیں ہے کیونکہ غالباً پہلے ہل لکڑی کے تھے کسی مضبوط درخت کے تنے یا شاخ کو چقماق کی دھار کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا لیکن ایک جدید حجری چٹان کی نقاشی میں ایک کسان دو بیلوں کے ساتھ ہل چلاتا نظر آتا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک عہد ساز ایجاد کے ظہور کی نشاندہی کرتا ہے۔ زراعت سے پہلے زمین (سر آرتھر کیتھ کے سرسری اندازے کے مطابق) دو کروڑ انسانوں کو سہارا دے سکتی تھی۔ ان لوگوں کی زندگی شکار اور جنگ کے خطرات کی وجہ سے کم ہو جاتی تھی۔ اب نسل انسانی کی آبادی میں اضافہ شروع ہوتا ہے جس نے انسان کے زمین پر تصرف کی تصدیق کر دی۔

اسی اثناء میں جدید حجری دور کے انسان تہذیب کی ایک اور بنیاد استوار کر رہے تھے یعنی جانوروں کا سدھانا اور افزائش نسل، بلا شبہ یہ ایک طویل عمل تھا جو غالباً جدید حجری دور سے پہلے شروع ہوا۔ انسان اور جانور کی سنگت میں ایک خاص ملنساری کا کردار رہا ہو گا۔ یہ آج بھی ہمیں غیر متمدن لوگوں کے جنگلی جانوروں کے پالنے، اپنے جھونپڑوں میں بندروں، طوطوں اور ایسے ہی ساتھیوں کو رکھنے میں نظر آ سکتا ہے۔ جدید حجری دور کی قدیم ترین باقیات کتے کی ہیں۔ جو نسلِ انسانی کا سب سے پرانا اور قابلِ احترام ساتھی ہے۔ کچھ مدت

بعد (چھ ہزار سال قبل مسیح) بکری، بھیڑ، سور اور بیل آتے ہیں اور سب سے آخر میں گھوڑا آتا ہے جو قدیم حجری دور کے انسان کے لئے شکار کا جانور تھا۔ جس کا اندازہ غار کی تصویروں سے ہوتا ہے۔ ان جانوروں کو پناہ گاہوں میں لے جا کر سدھایا گیا اور محبوب غلام بنا لیا گیا۔ سینکڑوں طریقوں سے اُسے استعمال میں لایا گیا تاکہ فرصت، دولت اور افرادی قوت حاصل کی جائے۔ زمین کے نئے مالک (انسان) نے غذا کی سپلائی میں سدھائے ہوئے جانور اور شکار دونوں استعمال کرنا شروع کر دیئے اور غالباً اسی دور میں اُس نے گائے کے دودھ کو غذا کے طور پر استعمال کرنا سیکھا۔

جدید حجری دور کے موجدین نے اوزاروں اور ہتھیاروں میں بتدریج اصلاح کی۔ ان کی باقیات میں چرخی، لیور، خرسان، سُوا، چمٹا، کلہاڑی، کدال، برچھی چھینی، تکلا، جولاہے کا راچھ، درانتی، آری، برف پر چلنے والی کھڑاویں، سوئیاں وغیرہ ہیں۔ یہاں نسلِ انسانی کی ایک اور بنیادی ایجاد — پہیہ ہے۔ صنعت اور تہذیب کے عمومی لوازمات میں سے ایک — جدید حجری عہد میں اسے قرص میں ڈھال دیا گیا۔ ہر طرح کے پتھر یہاں تک کہ معدنی شیشے کو بھی پیس دیا گیا، سوراخ کیا گیا اور صیقل شدہ شکل میں لایا گیا۔ چقماق کے پتھروں کو زیادہ وسیع پیمانے پر کھود کے نکالا گیا۔ انگلستان میں برینڈن کے کھنڈرات سے ہرن کے سینگ ملے ہیں۔ جن کی گرد آلود سطحوں پر کام کرنے والوں کی انگلیوں کے نشانات تھے، جنہوں نے یہ اوزار دس سال پہلے رکھے تھے۔ بلجیم میں جدید حجری عہد کے کان کن کا ہڈیوں کا ڈھانچہ ملا ہے جو گرتی ہوئی چٹان کے نیچے آ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ابھی تک ہرن کے سینگ کی کدال بھینچی ہوئی تھی۔ ہم سو صدیوں بعد بھی اُسے اپنے میں سے ایک سمجھ رہے ہیں اور اپنے کمزور تخیل میں اُس کی

دہشت اور تنوع کو محسوس کرتے ہیں۔ کتنے ہزار سالوں سے انسان زمین کے پیالے میں سے تہذیب کی معدنی بنیادیں نوچ رہا ہے۔

سوئیاں بنا کر انسان نے بُننا شروع کیا یا بُننا شروع کرنے کے لئے انسان کو سوئیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب وہ جانوروں کی کھالیں اور اون پہن کر زیادہ مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اُس نے بھیڑ کی اون اور پودوں کے ریشے سے اپنی پوشاک بنائی جس میں سے ہندو کا چوغہ، یونانی کا لوٹا اور مصریوں کی سکرٹیں یہاں تک کہ ساری نسلِ انسانی کی خوبصورت پوشاک بنی۔ پودوں کے رس اور زمینی معدنیات میں رنگوں کو ملا کر بادشاہوں کا زرق برق لباس بنایا جاتا۔ پہلے انسان نے پارچہ جات کو ایسے تہہ لگائی جس طرح وہ تنکوں کی تہہ لگاتا تھا، پھر اُس نے جانوروں کی کھالوں میں سوراخ کئے اور کھردرے ریشوں سے ان سوراخوں کو جوڑ دیا جیسے آج جوتے بنائے جاتے ہیں۔ بتدریج ریشے دھاگے میں ڈھل گئے اور سلائی عورتوں کے بڑے فنون میں سے ایک بن گئی۔ جدید حجری کھنڈرات سے ملنے والی پتھر کی سلائی دار پونی اور تکلا انسانی صنعت کی عظیم ابتدا کو منکشف کرتے ہیں۔ ان باقیات میں آئینے بھی ملتے ہیں۔ گویا تہذیب کیلئے ہر چیز تیار تھی۔

ابتدائی ترین قدیم حجری قبروں میں ظروف دریافت نہیں ہوتے۔ بلجیم میں میگڈیلینس تہذیب کی باقیات میں اس کے ٹکڑے ملتے ہیں۔ لیکن درمیانی حجری عہد میں مٹی کے برتنوں کا استعمال تھا۔ آرٹ کے آغاز کا ہمیں پتہ نہیں غالباً کسی غیر متمدن شاہد نے دیکھا کہ اس کے پاؤں سے مٹی میں جو کونڈا بنا اس میں پانی کم رستا تھا۔ کسی نزدیکی آگ سے گیلی مٹی کے ٹکڑے کے اتفاقیہ پک جانے سے اُسے اس اہم ایجاد کا پتہ چلا۔ اُسے اتنے وسیع مادے کے امکانات کا پتہ چلا، ہاتھ کے لئے اس قدر لچک دار اور اسے آگ یا سورج کے ذریعے سخت

کرنا بہت آسان تھا۔ بے شک اُس نے ہزاروں سال تک اپنا کھانا اور پانی شُتر مُرغ کے انڈوں، ناریل، کدو کی کھوپڑی، بیٹھا اور کوکونٹ اور سمندری خول ایسے ہی فطری برتنوں میں رکھے۔ پھر اُس نے لکڑی یا پتھر کے پیالے اور ڈوئی بنائی، گھاس اور سراں سے ٹوکریاں اور ٹوکرے بنائے۔ پھر اُس نے پکی ہوئی مٹی کے پائیدار برتن بنائے اور نسلِ انسانی کی بڑی صنعتوں میں سے ایک تخلیق کی۔ جہاں تک باقیات نشاندہی کرتی ہیں۔ جدید حجری دور کا انسان ظروف ساز کے چاک کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اپنے ہاتھوں کے ساتھ اس نے حسین شکلیں بنائیں، انہیں سادہ ڈیزائنوں سے سجایا اور ظروف سازی کی ابتداء کی جو شروع میں نہ صرف ایک صنعت تھی بلکہ آرٹ بھی۔

یہاں ہم ایک اور بڑی صنعت تعمیر ــــ کی شہادتیں دیکھتے ہیں۔ قدیم حجری عہد کے انسان نے غار کے علاوہ کسی اور مسکن کی نشاندہی نہیں چھوڑی لیکن جدید حجری باقیات میں ہم تعمیر کا سامان مثلاً سیڑھی، چرخی، بیدھ اور کڑا وغیرہ دیکھتے ہیں۔ جھیل کے رہنے والے ماہر بڑھئی تھے۔ شہتیر کو جوڑ کر انہیں نوکدار لکڑی کی میخوں کے ساتھ باندھ دیتے یا ان کے سروں کی چول پر چول بٹھا دیتے یا انہیں ٹیڑھے شہتیروں سے زیادہ مضبوط کر دیتے تھے۔ فرش مٹی کے تھے، دیواریں شاخوں کی جن پر مٹی چڑھی ہوتی تھی۔ چھتیں چھال بیاں یا سرکنڈے کی ہوتی تھیں۔ چرخی اور پہیے کی مدد سے بلڈنگ کے سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا اور بڑے بڑے پتھروں سے گاؤں کی بنیاد رکھی گئیں ــــ ٹرانسپورٹ بھی ایک صنعت بن گئی، چھوٹی کشتیاں بنائی گئیں۔ جن سے جھیلوں میں خوب آمد و رفت ہوتی ہو گی۔ پہاڑوں اور دور دراز کے براعظموں پر تجارت کی جاتی رہی۔ کہربا، پتھر اور معدنی شیشے کو دور دراز سے یورپ میں درآمد کیا گیا۔ ایک جیسے الفاظ، حروف، دیومالا، ظروف اور نمونے قبل از تاریخ کے

انسان کے مختلف گروہوں کے ثقافتی رابطوں کے بارے میں دھوکا دیتے ہیں۔

جدید حجری عہد نے ظروف سازی کے علاوہ کوئی آرٹ نہیں چھوڑا، نا ہی کوئی ایسی چیز چھوڑی جس کا قدیم حجری انسان کی نقاشی اور مجسمہ سازی سے موازنہ کیا جا سکے۔ انگلستان سے چین تک جدید حجری زندگی کے آثار میں پتھروں کے گول ڈھیر دیکھتے ہیں جنہیں Dolmens، سیدھے پتھروں کو Menhirs اور بہت مہیب پتھر کو Cromlechs کہتے ہیں ـــ ان پتھروں کا مقصد معلوم نہیں۔ غالباً ہم ان حجری عمارتوں کے مفہوم یا فریضے کو کبھی نہ سمجھ سکیں گے۔ شاید یہ قربان گاہیں اور مندروں کی باقیات ہیں۔ جدید حجری انسان کے مذاہب دیو مالا تھی جس سے وہ ہر روز سورج کی فتح اور شکست کا ڈرامہ کرتا تھا۔ زمین کی موت اور حیات نو اور زمین پر چاند کے عجیب و غریب اثرات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہو جب تک ہم قبل تاریخی آغاز کے بارے میں کوئی مفروضہ قائم نہیں کر لیتے۔ ہم اس وقت تک تاریخی عقائد کو نہیں سمجھ سکتے۔ غالباً ہیئتی ضروریات کی وجہ سے پتھروں کی ترتیب کا تعین ہوا اور جس طرح سٹینڈر کا خیال ہے۔ یہ ہمیں کیلنڈر کے متعلق گواہی دلاتی ہے۔ کچھ سائنسی علم بھی موجود تھا کیونکہ بعض جدید حجری عہد کی کھوپڑیاں سرجری کی شہادت دیتی ہیں اور کچھ ہڈیوں کے ڈھانچے بظاہر ٹوٹے ہوئے مگر بعد میں جڑے ہوئے اعضا کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہم قبل از تاریخ عہد کے انسان کی کامیابیوں کا مناسب اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ ہمیں ان کی زندگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خیال آرائی سے بچنا چاہیئے جو شہادت سے ماوراء ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ہمیں شک ہے کہ وقت نے ان باقیات کو تباہ کر دیا ہے جو قدیم اور جدید انسان کے درمیان فاصلے گھٹا سکتی تھیں۔ اس کے باوجود بھی عہد حجری کی ترقیوں کا بچا کھچا شمار یکارڈ

موجود ہے۔ قدیم حجری دور کے اوزار، آگ، آرٹ، جدید حجری عہد کی زراعت، جانور پالنا، بُنائی، ظروف سازی، تعمیر، ٹرانسپورٹ، ادویات، زمین پر نسلِ انسانی کا یقینی غلبہ اور بہت زیادہ آبادی۔ تمام بنیادیں رکھ دی گئی تھیں۔ تاریخی تہذیب کے لئے دھات اور تحریر اور ریاست کے علاوہ ہر چیز تیار ہو چکی تھی۔ انسان کو اپنی فکر اور کارنامے ریکارڈ کرنے کی ضرورت تھی۔ اس طرح نسلوں تک اس کی محفوظ طریقے سے ترسیل ہو سکتی تھی جس سے تہذیب کی ابتداء ہونی تھی۔

III تاریخ کی طرف

۱۔ دھات کاری کا آغاز

انسان نے کب اور کیسے دھات کا استعمال شروع کیا؛ ہمیں اس بات کا بھی قطعی علم نہیں ہم فقط قیاس آرائی کر سکتے ہیں کہ یہ اتفاقیہ ہوا اور ابتدائی باقیات کی عدم موجودگی سے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ جدید حجری عہد کے خاتمے پہ شروع ہوا۔ یہ دو چار ہزار سال قبل از مسیح کا دور تھا۔ ہمارے پاس ایسا تناظر ہے جس میں دھات کا دور (تحریر اور تہذیب کا بھی) فقط چھ ہزار سال کا ہے جو چالیس ہزار سال کے دورِ حجری اور انسانی زندگی کے دس لاکھ سالوں کا ضمیمہ ہے۔ ہماری تاریخ کا موضوع کتنا نیا ہے۔

انسانی استعمال میں آنے والی قدیم ترین دھات تانبہ تھی۔ ہمیں یہ سوئٹزرلینڈ کے مقام روبن ہاسن پہ جھیل کے مسکنوں میں ملتی ہے جو چھ ہزار سال قبل از مسیح پرانی ہے۔ قبل تاریخی میسوپوٹیمیہ میں تین ہزار ایک سو سال قبل از مسیح پرانی اور شمالی امریکہ کے ٹیلہ سازوں کی یادگاروں میں نامعلوم تاریخ تک پرانی ملتی

ہیں۔ دھات کا عہد اس کی دریافت سے شروع نہیں ہوا بلکہ آگ اور کام کے ذریعے انسانی مقصد میں ڈھالنے کے ساتھ شروع ہوا۔ ماہرین دھات کا یقین ہے کہ پتھر سے تانبے کا پہلی مرتبہ بننا اتفاقی حادثہ تھا جب کسی قدیم کیمپ میں آگ نے چٹانوں پر لگے تانبے کو پگھلا دیا۔ ایسے واقعات ہمارے زمانے میں غیر متمدن کیمپ میں آگ لگنے سے بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے قدیم انسان نے جو پتھر سے کام چلا رہا تھا، اس بار بار ہونے والے واقعے سے لوچ دار دھات کو ہتھیار اور اوزار بنانے کے لئے زیادہ پائیدار خیال کیا۔ غالباً پہلی مرتبہ یہ دھات فطری شکل میں استعمال کی گئی۔ بہت بعد میں تقریباً تین ہزار پانچ سو سال قبل از مسیح، مشرقی بحیرہ روم کے ارد گرد کے علاقے میں انسان نے کچی دھات کو پکا کر خالص بنانے کا فن دریافت کیا۔ پھر پندرہ سو سال قبل مسیح (جس طرح مصر میں ریخ مارا کے مقبرے پر کم ابھرواں مجسمے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے) انسان نے دھات کاری شروع کی۔ تانبے کو مٹی یا ریت کے برتن میں ڈال کر مطلوبہ شکل مثلاً نیزے کی انی یا کلہاڑی میں ڈھالنے کے لئے ٹھنڈا کیا جاتا۔ ایک مرتبہ جب اس عمل کو دریافت کر لیا گیا تو کئی دھاتوں پر اس کا اطلاق کیا گیا اور انسان کو ایسے عالی شان عناصر ملے جنہوں نے اس کی عظیم صنعتوں کی تعمیر کرتی اور اسے زمین، سمندر اور ہوا پر فتح دینی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بحیرہ روم کی زمینیں تانبے میں زرخیز تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم نئی تہذیبیں چوتھے ہزار برس میں ایلم، میسوپوٹیمیہ اور مصر میں ظاہر ہوئیں اور دنیا کو بدل لینے کے لئے تمام سمتوں میں پھیل گئیں۔

لیکن تانبہ بذاتِ خود نرم اور بعض مقاصد کے لئے خاصا موزوں تھا (اس کے بغیر ہمارے بجلی کے عہد کا کیا بنتا؟) لیکن بڑے کاموں کے لئے ناکافی تھا۔ اسے

سخت کرنے کے لئے ملاوٹ کی ضرورت تھی۔ اگرچہ فطرت نے بہت ساری ملاوٹیں مہیا کیں اور پہلے سے ٹین یا جیست کے ساتھ ملا ہوا تانبہ بھی حاصل ہوا۔

انسان اگلا قدم اٹھانے سے پہلے صدیوں تک وقت ضائع کرتا رہا یعنی کس طرح ایک دھات کو دوسری کے ساتھ ملا کر مرکبات حاصل کئے جائیں جو اُس کی ضروریات کے لئے زیادہ موزوں ہوں۔ یہ دریافت کم از کم پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ کیونکہ کریٹش کی باقیات میں تین ہزار سال قبل از مسیح میں کانسی ملی۔ مصر کے باقیات میں دو ہزار آٹھ سو سال قبل از مسیح اور ٹرائے کے دوسرے شہر میں دو ہزار سال قبل از مسیح کے باقیات میں بھی کانسی ملی۔ ہم کانسی کے عہد کے متعلق زیادہ صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ دھات مختلف لوگوں کے پاس مختلف ادوار میں آئی اور اس طرح یہ اصطلاح تاریخی مفہوم کے بغیر ہوگی۔ علاوہ ازیں بعض تہذیبیں مثلاً فن لینڈ، شمالی روس، پولی نیشیا، وسطی افریقہ، جنوبی ہندوستان، شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور جاپان پتھر کے عہد سے بلاواسطہ لوہے تک پہنچیں۔ ان تہذیبوں میں جہاں کہیں کانسی ملتی بھی ہے تو لگتا ہے کہ پروہتوں، اشرافیہ اور بادشاہوں کی ماتحت ہے۔ جبکہ عام انسان کو ابھی تک پتھر کے ساتھ ہی گزارہ کرنا ہوتا تھا۔ "قدیم حجری دور" اور "جدید حجری دور" کی اصطلاحات بہت حد تک اضافی ہیں اور اپنے عہد کا مفہوم دینے کی بجائے حالات کا مفہوم دیتی ہیں۔ بہت ساری غیر متمدن قومیں (اسکیمو اور پولی نیسیا کے باسی) آج تک پتھر کے عہد میں زندہ ہیں اور لوہے کو فقط نزاکت سمجھتے ہیں جو کھوجیوں نے تلاش کیا ہے۔ کیپٹن کگ جب ۱۷۷۰ء میں نیوزی لینڈ گیا تو اس نے چھ پنیس کی میخ سے کئی سور خریدے۔ ایک اور سیاح نے ٹواگ جزیرے کے باشندوں کے متعلق لکھا ہے کہ لوہے کے لالچی تھے اور جہازوں میں سے میخیں

نکال لینی چاہتے تھے۔

کانسی مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے لیکن اسے بنانے کے لئے تانبے اور جست کی ضرورت ہوتی ہے جو وسیع مقدار میں اور سہولت سے میسر نہیں تھے کہ انسان کو صنعت اور جنگ کے لئے بہترین سامان مل سکتا۔ جلد یا بدیر لوہے کی ضرورت تھی لیکن یہ تاریخ کی بے قاعدگی ہے کہ اتنی زیادہ مقدار ہونے کے باوجود تانبے اور کانسی کی طرح یہ جلدی سامنے نہ آسکا۔ انسان نے شہابی لوہے سے ہتھیار بنانے کا آرٹ شروع کیا ہوگا۔ جس طرح ٹیلہ سازوں نے کیا تھا اور جس طرح آج بھی بعض غیر متمدن قومیں کرتی ہیں۔ پھر شاید انہوں نے آگ کے ذریعے کچی دھات کو پگھلانا شروع کیا ہوگا اور کوٹ کر اسے ٹھیک کیا ہوگا۔ شہابی لوہے کے ٹکڑے مصری قبروں میں ملے ہیں اور بابل و نینوا کی نقش کاری لوہے کو حمورابی (دو ہزار ایک سو سال قبل از مسیح) کے دارالخلافہ میں مہنگی اور نایاب شے کے طور پر ظاہر کرتی ہے۔ شمالی رہوڈیشیا میں تقریباً چار ہزار سال پرانی لوہے کی فاؤنڈری دریافت ہوئی ہے۔ جنوبی افریقہ میں کان کنی کوئی جدید ایجاد نہیں ہے۔ سب سے پرانا کوٹا ہوا لوہا چاقوؤں کا مجموعہ ہے جو فلسطین میں گیرار کے مقام پر ملا ہے۔ پیٹرک نے اس کی تاریخ تیرہ سو پچاس سال قبل از مسیح مقرر کی ہے۔ مصر میں ایک صدی بعد دھات سامنے آئی ہے۔ یہ عظیم راسیس دوم کا دور تھا۔ ایک اور صدی بعد یہ ایگین میں ملتی ہے۔ مغربی یورپ میں یہ پہلے آسٹریا کے مقام ہال سٹیٹ میں نو سو قبل از مسیح میں سامنے آتی ہے۔ اور سوئٹزرلینڈ کی لاتینے صنعت میں پانچ سو سال قبل از مسیح میں سامنے آتی ہے۔ یہ انڈیا میں سکندر اعظم کے ساتھ، امریکہ میں کولمبس کے ساتھ اور اوشیانے میں کیپٹن کُک کے ساتھ داخل ہوئی۔ اس آسانی کے ساتھ صدی بعد صدی لوہے نے زمین پر فتح حاصل کر لی۔

۲۔ تحریر

لیکن تہذیب کی طرف سفر میں سب سے اہم قدم تحریر کا تھا۔ جدید حجری عہد کے ظروف کے ٹکڑوں پر منقش لکیریں پائی جاتی ہیں جنہیں بعض طالب علموں نے علامتیں قرار دیا ہے۔ یہ مشکوک بات ہے لیکن ممکن ہے کہ تحریر مخصوص سوچ کی منقش علامتوں کی صورت میں ناخنوں اور انگلیوں کے نشانات سے شروع ہوئی ہو جو نرم مٹی پر زیبائش کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ ابتدائی سمیری تصویر نگاری میں پرندے کی تصویر سوسا اور ایلم کی قدیم ترین ظروف سازی پر پرندے کی زیبائش سے مشابہت رکھتی ہے۔ غلے کی ابتدائی تصویر براہِ راست غلے کی زیبائش سے لی گئی جو سوسا اور سمیریا کے برتنوں پر تھی۔ سمیریا کا سیدھا سکرپٹ ۱؎ اپنے پہلے ظہور میں علامتوں اور تصویروں کی مختصر شکل ہے۔ جو میسوپوٹیمیا اور ایلم کی قدیم ظروف سازی پر منقش تھیں۔ پینٹنگ اور مجسمہ سازی کی طرح تحریر بھی اپنی اصل میں کوزہ گری کی آرٹ ہے۔ یہ ڈرائنگ کی صورت میں شروع ہوئی اور جس مٹی نے ظروف ساز کو برتن، مجسمہ ساز کو مورت اور معمار کو اینٹیں دیں۔ اُس مٹی نے لکھنے والے کو لکھائی کا سامان مہیا کیا اس ابتداء سے میسوپوٹیمیا کی پیکائی تحریر تک ایک قابلِ فہم اور منطقی ارتقاء ہے۔

ہم جن قدیم ترین گرافک علامتوں سے واقف ہیں۔ وہ فلنڈرز پیٹری نے مصر، اسپین اور مشرقِ قریب کے قبل از تاریخ مقبروں میں پائے جانے والے ٹھیکروں، برتنوں اور پتھروں سے حاصل کیں۔ اپنی عمومی فیاضی سے اُس نے ان کے ساتھ سات ہزار سال کی عمر منسوب کر دی۔ بحیرہ روم کی اس دریافت

میں تقریباً تین سو علامتیں شامل تھیں۔ ان میں سے زیادہ تمام علاقوں میں ایک جیسی تھیں جو بحیرہ روم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پانچ ہزار سال کے تجارتی تعلقات کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ یہ تصویریں نہیں تھیں بلکہ زیادہ تر کاروباری علامتیں تھیں، حاشیداد کے نشانات، مقدار یا دوسری کاروباری یادداشتیں آج یورڈوازی یہ سوچ کر خوش ہو سکتی ہے کہ ادب کا آغاز کاروباری بلوں سے ہوا۔ علامتیں حروف نہیں تھیں کیونکہ وہ پورے الفاظ یا تصورات کی نمائندگی کرتی تھیں۔ لیکن ان میں سے بہت ساری حیران کن حد تک اہل فونیشیا کے حروفِ ابجد کی طرح تھیں۔ پیڑی نتیجہ نکالتا ہے کہ "علامتوں کا وسیع نظام غیر متمدن عہد میں بتدریج استعمال میں لایا گیا۔ جس کے کئی مقاصد تھے۔ یہ تجارت کے کام آیا۔ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پھیل گئے۔ حتیٰ کہ چند درجن علامتیں کامیاب ہو کر کاروباری طبقے کی مشترکہ ملکیت بن گئیں۔ جبکہ دوسری شکلوں کی مقامی باقیات بتدریج تنہائی کا شکار ہو کر ختم ہو گئیں۔ یہ نشانیاں حروفِ ابجد کا آغاز تھیں۔ ایک دلچسپ نظریہ ہے جو فقط پروفیسر پیڑی ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان ابتدائی تجارتی علامتوں کا ارتقاء کچھ بھی ہو ان کے ساتھ ساتھ تحریر کی صورت نمودار ہوتی رہی جو ڈرائنگ اور پینٹنگ کی شاخ تھی اور اس نے تصاویر کے ذریعے مربوط سوچ کو پیش کیا۔ سپیریئر جھیل کے نزدیک چٹانوں میں ان خام تصاویر کی باقیات ہیں جن کے ذریعے امریکی انڈینز نے آنے والی نسلوں کے لیئے اس عظیم جھیل کو پار کرنے کی کہانی بیان کی۔ ڈرائینگ کا ایسا ہی ارتقاء تحریر کی صورت میں جدید حجری عہد میں واقع ہوا۔ یقیناً تین ہزار چھ سو سال قبل از مسیح تک یا شاید اس سے کافی پہلے ایلم، سمیریا اور مصر میں

سوچ کی تصویریں (Thought-Picture) کا نظام ترقی کر چکا تھا جسے heirographics کہتے تھے۔ کیونکہ انہیں زیادہ تر پروہت بناتے تھے۔ ایسا ہی نظام پچیس سو سال قبل از مسیح میں کریٹ میں ظاہر ہوا۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے کہ کس طرح ان heirographics کو، جو سوچ کی نمائندگی کرتے تھے۔ استعمال کے ذریعے علامتوں کے مجموعے میں ڈھالا گیا جو بچوں کی نشاندہی کرتے تھے اور بالآخر علامتوں کو پورا ہجہ ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی ابتدائی آواز نکالنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس طرح حروف وجود میں آئے۔ حروفِ تہجی کی ایسی تحریر شاید تین ہزار سال قبل از مسیح میں مصر میں موجود تھی جبکہ کریٹ میں یہ سولہ سو سال قبل از مسیح میں نمودار ہوئی۔ فونیشین نے حروفِ تہجی تخلیق نہیں کئے۔ غالباً انہوں نے مصر اور کریٹ سے درآمد کیا۔ انہوں نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے ٹائر، سیڈان اور بائبلوز سے درآمد کر کے بحیرہ روم کے ہر شہر میں پھیلا دیا۔ وہ حروف تہجی پیدا کرنے والے نہیں تھے بلکہ اس کے دلال تھے۔ ہومر کے عہد میں یونانی اس فونیشیائی حروف تہجی کو اپنا رہے تھے اور اس کے پہلے دو حروف کو سامی ناموں سے پکار رہے تھے (الفا، بیٹا) عبرانی الف، بیت)

تحریر ــــ تجارت کی پیداوار اور سہولت لگتی ہے یہاں بھی تہذیب تجارت سے بہت کچھ حاصل کرتی ہے۔ جب پروہتوں نے تصاویر کا ایسا نظام ایجاد کر لیا جس کے ذریعے جادوئی، رسمی اور طبی فارمولے لکھ سکیں تو تاریخ میں سیکولر اور پروہتائی سوچ میں تضاد پیدا ہوا اور گویائی کے بعد عظیم ترین انسانی ایجاد واقع ہوئی۔ تحریر کی ترقی نے علم کا ریکارڈ رکھنے اور ترسیل کے ذرائع مہیا کر کے، سائنس کو اکٹھا کر کے، ادب کی ترقی اور مختلف قبیلوں میں امن

اور سلامتی کے پھیلاؤ کے ذریعے، تہذیب کو پیدا کیا۔ ایک زبان بولنے اور لکھنے کے سبب یہ ایک ریاست کے سائے میں آ گئے۔ تحریر کا ابتدائی ترین ظہور اس پیچھے ہٹتے ہوئے مرحلے کی نشاندہی کرتا ہے جہاں سے تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔

۴۔ گم شدہ تہذیبیں

تہذیب یافتہ قوموں کی تاریخ تک پہنچتے ہوئے یہ بات ذہن نشین کرنی ہو گی کہ ہم ہر تہذیب کا نہ صرف ایک حصہ منتخب کر رہے ہوں گے بلکہ ان قلیل تہذیبوں کا تذکرہ کر رہے ہوں گے۔ جو زمین پر زندہ رہ گئیں۔ ہم پوری تاریخ میں جاری و ساری اساطیر کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ تہذیبیں جو کبھی بہت بڑی تھیں فطرت کی کسی آفت یا جنگ کی وجہ سے تباہ ہو گئیں اور ان کا کچھ بھی باقی نہ بچا۔ کریٹ، سمیریا اور یوکٹان کی کھدائی سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایسی کہانیاں کس قدر سچی ہو سکتی ہیں۔

ان گم شدہ تہذیبوں میں سے ایک کے کھنڈرات بحر الکاہل میں ہیں۔ ایسٹر جزیرے کی زبردست مجسمہ سازی، پولی نیشیا طاقتور قوموں اور بہادر جنگجوؤں کی روایت جو کبھی سموا اور تبیتی کے لئے قابلِ احترام تھیں۔ ان کے موجودہ باشندوں کی فنکارانہ اہلیت اور شاعرانہ حساسیت اور ایک ایسی قوم کی عظمتِ رفتہ کی نشاندہی کرتی ہے، جو تہذیب میں نہ ڈھل سکی مگر اعلیٰ مقام سے نیچے گری۔ بحرِ اوقیانوس میں آئس لینڈ سے ساؤتھ پول تک سمندروں کی اٹھی ہوئی مرکزی تہہ اُس اسطورہ کی حمایت کرتی ہے جسے افلاطون نے بہت خوبصورت طریقے سے بیان کیا۔ ایک ایسی تہذیب جو کبھی ایک ایسے جزیرے پر آباد تھی جو یورپ اور ایشیاء میں خشکی کا ٹکڑا تھا۔ یہ تہذیب اچانک گم ہو گئی جب ایک ارضیاتی ہلچل

سے سمندر نے خشکی کا یہ ٹکڑا ہڑپ کر لیا۔ ٹرائے کو نئی زندگی دینے والا شلیمان یہ یقین رکھتا تھا کہ بحر اوقیانوس نے یورپ اور یوکتان کی تہذیبوں کے درمیانی رابطے کا کام دیا اور مصری تہذیب اوقیانوس ہی سے ابھری۔ شاید امریکہ بھی اوقیانوس تھا اور جدید حجری دور میں کوئی قبل میئن Pre-Mayan تہذیب افریقہ اور یورپ سے تعلق رکھتی ہوگی۔ شاید ہر دریافت ایک دریافت نو ہے۔ ارسطو کے خیال میں یہ بات یقینی طور پر امکانی ہے کہ بہت ساری تہذیبیں آئیں، انہوں نے عظیم ایجادیں اور عیاشیاں کیں، تباہ ہوئیں اور انسانی یادداشت سے مٹ گئیں۔ بیکن کہتا ہے کہ تاریخ ایک تباہ شدہ بحری جہاز کے تختوں کی مانند ہے۔ ہم خود کو تسلی دیتے ہیں کہ انفرادی یادداشت کو تجربے کا زیادہ حصہ بھول جانا چاہیئے تاکہ ہمارا فہم قائم رہے۔ چنانچہ نسلِ انسانی نے اپنی وراثت میں سے تہذیبی تجربات کا زیادہ واضح اور عالیشان حصہ محفوظ رکھا ہے۔ اگر یہ نسلی ورثہ دس گنا بیش قیمت ہوتا تو اسے کوئی بھی پورا جذب نہ کر سکتا۔

۴۔ تہذیب کے گوشوارے

لاجواب سوالات کے اس باب کو اس کتاب کے ساتھ ہی ختم کرنا مناسب ہوگا کہ تہذیب کا آغاز کہاں سے ہوا؟ — یہ بات بھی لاجواب ہے۔ اگر ہم تاریخ کنے دھندلکوں سے نمٹنے والے ماہرین ارضیات پر بھروسہ کر سکیں تو ان کے مطابق وسطی ایشیاء کے خشک علاقے کبھی نم اور معتدل تھے۔ یہاں بہت جھیلیں اور ندیاں تھیں۔ آخری برف کی لہر کی مراجعت نے اس خطے کو خشک کر دیا حتیٰ کہ شہروں اور ریاستوں کے لئے بارش ناکافی رہ گئی۔ لوگ شہروں کو خالی کر کے پانی کی تلاش میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب کی طرف بھاگ نکلے۔

جن میں سے آدھے ریگستان میں بیکٹرا کے شہر میں مدفون ہیں جس کے بائیس میل کے دائرے میں آبادی ہوگی۔ ۱۸۶۸ء میں مغربی ترکستان کے اسی ہزار لوگوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا کیونکہ بڑھتی ہوئی ریت سے ان کا ضلع تہ و بالا ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگوں کا یقین ہے کہ بہت سے علاقے جو اب مر رہے ہیں۔ نظم و ضبط، اخلاق و دستور، سہولت و ثقافت کی جو تہذیب کو متشکل کرتے ہیں، زبردست ترقی دیکھ چکے ہیں۔

۱۹۰۷ء میں پمپلی نے جنوبی ترکستان میں الوآ کے مقام پر برتن اور تہذیب کے دیگر باقیات دریافت کئے جسے اُس نے نو ہزار سال قبل از مسیح سے منسوب کیا ہے۔ جس میں چار ہزار سال کا امکانی مبالغہ ہو سکتا ہے۔ یہاں گندم، باجرہ اور جوار کی کاشت ہوتی تھی۔ تانبے کا استعمال، جانوروں کا سدھانا اور برتنوں کی زیبائش کی روایت موجود تھی۔ جس کے لئے کئی صدیوں کے فنی پس منظر اور روایت کی ضرورت تھی۔ بظاہر ترکستان کی تہذیب پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم تھی۔ غالباً اس کے مؤرخین بھی تھے جنہوں نے تہذیب کے مآخذات کی تلاش کے لئے ماضی میں غوطے لگائے اور فلسفی جنہوں نے مرتی ہوئی قوم کے تنزل کا ماتم کیا۔

اس مرکز سے ہم اپنے تخیل کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے لوگ جو بے ابر خشک آسمان اور پھٹی ہوئی زمین سے تین سمتوں میں سفر کر گئے۔ اپنے ساتھ اپنے فنون اور تہذیب کو بھی لے گئے، مشرق میں آرٹ چین، منشوریہ اور شمالی امریکہ میں پہنچا، جنوب میں ہندوستان، مغرب میں ایلم، سمیریا، مصر حتی کہ اٹلی اور سپین تک قدیم ایلم (جدید فارس) میں سوسا کے مقام پر ایسی باقیات پائی گئی ہیں جو الوآ کی باقیات سے ملتی ہیں۔ متخیلہ الوآ اور سوسا کے درمیان تہذیبی تعلق کا جواز پیش کرتی ہے۔ یہ (چار ہزار سال قبل از مسیح) تہذیب کے آغاز کا

زمانہ تھا۔ اسی طرح کے فنون اور مصنوعات میں تعلق میسوپوٹیمیا اور مصر کے تعلقات کا غماز ہے۔

ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کون سی تہذیب پہلے آئی اور کون سی بعد میں، شاید اس سے زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہ اپنی اصل میں ایک خاندان اور نمونے کی طرح تھیں۔ اگر ہم اپنے معزز پیشروؤں کے احترام کا ارتکاز کریں اور ایلم اور سمیریا کی تہذیب کو مصر سے پہلے رکھیں تو یہ غیر روایتی اختراع کی جھوٹی عظمت نہیں ہوگی بلکہ ایشیائی تہذیبوں کے دور کا اگر افریقہ اور یورپ کی تہذیبوں سے موازنہ کریں تو یہ ہمارے علم کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے جوں جوں آثار قدیمہ کے بیلچے نیل کے ساتھ ساتھ ایک صدی کی کامیاب تحقیق کے بعد سویز سے عرب، فلسطین، میسوپوٹیمیا اور ایران تک پہنچیں گے جو ہر سال کی بڑھتی ہوئی تحقیق کے ساتھ ممکن ہے۔ یہ بات سامنے آئے کہ یہ میسوپوٹیمیا کے دریاؤں کا زرخیزہ دوآبہ ہی ہو جس نے تہذیب کے ڈرامے کے سب سے ابتدائی مناظر دیکھے ہوں۔

فکشن ہاؤس کی نئی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
میرے ماہ و سال (یادداشتیں)	جاوید شاہین	120/-
عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان	ہربنس مکھیا / رشید ملک	130/-
جرمن لوک کہانیاں	شفیع عقیل	160/-
پنجاب کی سیاسی جدوجہد	بھگت سنگھ بلگہ / یاسر جواد	100/-
رسل کی آپ بیتی	برٹرینڈ رسل / قاضی جاوید	240/-
لوگوں کو سوچنے دو	برٹرینڈ رسل / قاضی جاوید	150/-
شاہ عبداللطیف بھٹائی	ایچ۔ٹی۔سورلے / پروفیسر ریاضی صدیقی	250/-
تلاشِ حق (نیا ایڈیشن)	مہاتما گاندھی	250/-
سہ ماہی تاریخ شمارہ نمبر (19)	ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی	100/-
کلیاتِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	500/-
خلیل جبران کے عہد ساز افسانے	مرتب: حیدر جاوید سیّد	270/-
خلیل جبران کے عہد ساز ناول	مرتب: حیدر جاوید سیّد	190/-
خطوطِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	90/-
خلیل جبران فلسفہ و حکایات	مرتب: حیدر جاوید سیّد	100/-
کلامِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	90/-
اقوالِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	90/-

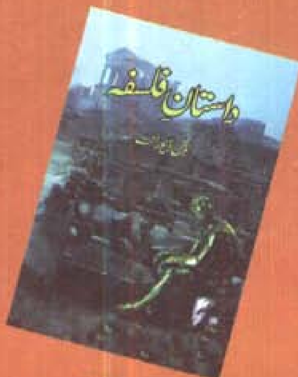
آپ بیتیاں

رسل کی آپ بیتی — برٹرینڈ رسل/قاضی جاوید — 240/-
میرے ماہ وسال — جاوید شاہین — 100/-
آپ بیتی ول ڈیورانٹ اور ایریل ڈیورانٹ — ول ڈیورانٹ/ایریل ڈیورانٹ — 350/-
اس آباد خرابے میں — اختر الایمان — 130/-
در در ٹھوکر کھائے — ڈاکٹر مبارک علی — 100\-
باتیں لاہور کی — سوم آنند — 130/-
تلاش حق — مہاتما گاندھی — 250/-
اپنی کہانی — راجندر پرشاد — 450/-
مشرق کی بیٹی — بے نظیر بھٹو — 600/-
خانہ بدوش — اجیت کور — 100/-
خواب باقی ہیں — آل احمد سرور — 170/-
یادوں کی دنیا — یوسف حسین خان — 180/-
اعمال نامہ — سر رضا علی — 230/-
میری جدوجہد — ہر ایڈولف ہٹلر — 150/-
تزک ہٹلری — ہر ایڈولف ہٹلر — 450/-
داستان مسولینی — بینٹو مسولینی — 150/-
گورکی کی آپ بیتی — میکسم گورکی — 350/-
ٹالسٹائی کی آپ بیتی — لیو ٹالسٹائی — 200/-
گیان سنگھ شاطر کی آپ بیتی — گیان سنگھ شاطر — 350/-
خودگذشت — ڈاکٹر احمد محی الدین — 120/-
لطف اللہ کی آپ بیتی — لطف اللہ — 150/-
پنجاب کے سو سال — پرکاش ٹنڈن — 150/-
بیرون پنجاب — پرکاش ٹنڈن — 150/-
میری داستان — فرحت اللہ بیگ — 200/-
غبار زندگی — حسن نواز گردیزی — 180/-

سوانح عمری

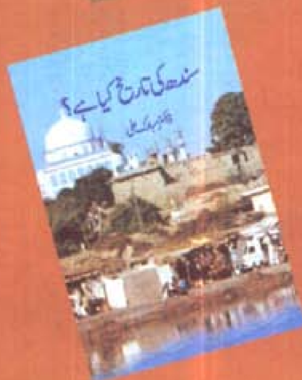
کورش اعظم	ہیرلڈلیم	200/-
صلاح الدین ایوبی	ہیرلڈلیم	300/-
عمر خیام	ہیرلڈلیم	200/-
منگول اور ان کا سردار	ہیرلڈلیم	100/-
سلیمان عالی شان	ہیرلڈلیم	250/-
ہنی بال	ہیرلڈلیم	170/-
بابر	ہیرلڈلیم	160/-
نور محل	ہیرلڈلیم	160/-
چنگیز خان	ہیرلڈلیم	100/-
سکندر اعظم	ہیرلڈلیم	240/-
امیر تیمور	ہیرلڈلیم	180/-
تاتاریوں کی یلغار	ہیرلڈلیم	200/-
قسطنطنیہ	ہیرلڈلیم	160/-
تین عظیم فاتح	ہیرلڈلیم	500/-
تین عظیم جنگجو سپہ سالار	ہیرلڈلیم	500/-
شاہ عبداللطیف بھٹائی	ایچ۔ٹی۔سورلے	250/-
تین عظیم ڈکٹیٹر	مرتب: اسلم کھوکھر	500/-
اتاترک	مرزا محمد دہلوی	130/-
وہائٹ ہاؤس کے مکین	سویدا حنا	250/-
دنیا کی نامور شخصیات	ایلین بلیک ووڈ	250/-
تاریخ ٹیپو سلطان	سید میر علی کرمانی	300/-
اورنگ زیب عالمگیر	شبلی نعمانی / ڈاکٹر اوم پرکاش پرشاد	160/-
باطو خان	وائی یان	250/-
ابراہام لنکن	ڈیل کارنیگی	130/-

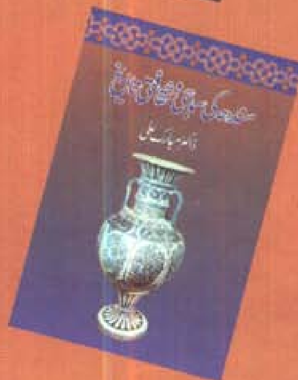














فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور